خالد سہیل

زندگی میں خلا

خالد سہیل

تعداد اشاعت — ایک ہزار

سال اشاعت — ۱۹۸۷ء

سرورق — موجد

ناشر — یو-آئی پبلشر
۱۲۹۶- بلور اسٹریٹ ویسٹ، ٹورنٹو، کینیڈا

قیمت — پانچ ڈالر

ان مشرقی بچوں کے نام
جو
مغرب میں پرورش پارہے ہیں

فہرست

اشفاق حسین

رُوشن آنکھیں اور شہرِ مثال

یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں پاکستان سے باہر کینڈا کی سرزمین پر، ایک ادبی محفل میں شریک تھا۔ سب کچھ وہی تھا جیسا کہ پاک و ہند کے کسی مشاعرے میں متوقع ہو سکتا ہے۔ بس فرق صرف یہ تھا کہ یہ آل پاکستان یا آل انڈیا مشاعرہ نہ تھا بلکہ آل کینڈا و امریکہ مشاعرہ تھا۔ شعرار جن شہروں سے شرکت کے لیے آئے تھے اُن میں دلی، لکھنؤ، کراچی یا لاہور کے بجائے نیویارک، لاس اینجلس، ٹورانٹو اور مانٹریال وغیرہ کے نام تھے۔ یہ محفلِ مشاعرہ صبح تک جاری رہی لیکن مشاعرے کے بعد، گھر لوٹتے ہوئے کافی دیر تک میں یہ سوچتا رہا کہ اس تمام ادبی شب بیداری کے نقشے میں شمالی امریکہ کہاں تھا ——؟ سوائے اس کے کہ بعض شعرار کے یہاں ہلکے سے ایک آدھ ایسے اشارے ضرور ملے، جن میں، پردیس میں دل پر گزرنے والی واردات کا بیان، یا غریب الوطنی کا دکھ تھا، یا ہجرت کے وہی چھپے چھپائے نوالے تھے جس کی طرز کے ڈانڈے ؎ خوش رہو اہلِ چمن ہم تو چمن چھوڑ چلے، والی کیفیات کی صدائے بازگشت معلوم ہوتے تھے۔ اس پورے وجود میں کہیں کہیں دل کی دھڑکنیں محسوس کی جا سکتی تھیں لیکن ایسا تھا کہ آنکھیں نہیں تھیں۔

بے آنکھوں کے اس چہرے کی تحریروں کو پڑھنا اور پھر ان تحریروں سے معانی کی ایسی لکیروں کو جنم دینا جو کسی واضح پیکر کے خدوخال کو نمایاں کر سکیں، اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

شمالی امریکی اردو ادب کے منظرنامے میں دلوں کی دھڑکنیں تو ہیں (شاعری کی حد تک) مگر آنکھیں اور وہ بھی روشن آنکھیں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ اس میں اردو شاعری کی کچھ اپنی لغت کی مجبوریاں اور خصوصاً غزل کے مزاج کی پابندیاں بھی مانع ہیں۔ البتہ نثر کے میدان میں، امکانات کا ایک شہرِ مثال ضرور بسایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس شہرِ مثال کی تعمیر کے لیے جس گارے اور مٹی کی ضرورت ہے، وہ ابھی تک صحیح معنوں میں تیار نہیں ہے۔

ایسی گھُپ اندھیروں والی راتوں میں، جب کہیں کوئی شمع جلتی ہوئی نظر آتی ہے تو ایک لمحے

کے لیے آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں۔ خالد سہیل کے افسانوں کو پڑھ کر پہلا تاثر کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ، اُمید اور اس کے ارد گرد گھومتے ہوئے امکانات کی ایک شمع ہے جسے خالد نے "زندگی میں خلا" کے نام سے موسوم کیا ہے۔

افسانوں کے اس مجموعے میں "کچھ" ہے اور "بہت کچھ" نہیں بھی ہے۔ بہت کچھ اس لیے نہیں کہ عظیم تحریریں، وقت، جذبے، مشاہدے اور اظہار کے صبر آزما لمحوں کے گزرنے کے بعد ہی وجود میں آتی ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خالد ابھی ان کٹھن اور جان لیوا لمحوں سے نہیں گزرا ہے لیکن اُس کے قدموں کے اولین نشانات پر جب نظر جاتی ہے تو امکانات کی ایک کہکشاں سی جگمگاتی ہوئی ضرور نظر آتی ہے۔ اُس کے ادبی سفر کی اس منزل پر، اُسے عظیم افسانہ نگار کہہ کر گمراہ نہ کرنا، خالد اور اُس کے قاری دونوں کے حق میں شاید بہتر ہو۔

جہاں تک اس "کچھ" کا تعلق ہے تو یہ بھی بڑا بھاری پتھر ہے اور خالد کے ہاتھ اسی بھاری پتھر کے نیچے دبنے کے بعد، پیمانِ وفا باندھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ پیمانِ وفا کیا ہے؟ یہیں سے خالد کے ذہن کو سمجھنے کی کلید ہاتھ لگتی ہے۔

اُس کے صرف چند افسانے پڑھنے کے بعد ہی اُن افسانوں میں نظر آنے والی شخصیت سے تعارف زیادہ مشکل نہیں ہوتا اور پھر جو تصویر بنتی ہے اُس کے خد و خال بتاتے ہیں کہ یہ شخصیت، ایک ذہین نوجوان کی ہے، جس کے چہرے پر دونوں آنکھیں سلامت ہیں اور وہ ان آنکھوں سے چیزوں کو اس طرح دیکھنے کے لیے تیار نہیں جیسا کہ عموماً دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بلکہ وہ ان کو اس طرح دیکھتا ہے یا کم از کم اس طرح دیکھنے کی کوشش کرتا ہے جیسا کہ وہ ہیں۔ اور یہاں سے اس کے لہجے میں کڑوے پن، بغاوت اور غصّے کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ اس کا سب سے اچھا اور بھرپور اظہار اُس کے افسانے "جڑیں، شاخیں، پھل" میں ہوا ہے۔ تارکینِ وطن کی نئی نسل کیا محسوس کرتی ہے؟ اس کا اظہار ایک کردار کے ذریعے اسی افسانے میں یوں کیا ہے۔

"میں ابو سے تنگ آ گئی ہوں۔ اسلام اور پاکستان کے نام پر ناٹک زیادہ عرصہ نہیں چل سکتا۔ میرے لیے یہ دونوں الفاظ گالی بن چکے ہیں۔ میرا بس چلے تو آج ہی گھر سے بھاگ جاؤں۔"

یہ تو اُس نسل کا ذکر ہے جو کینیڈا کے ماحول میں پلی بڑھی۔ اب ذرا اُس نسل کی طرف آیئے جو ہوش سنبھالنے کے بعد، اپنے وطن سے یہاں آ کر بس گئی۔ یہ نوجوان نسل، اپنے غصّے، کڑوے پن اور بغاوت کا اظہار یوں کرتی ہے۔

"جہاں جنسی تعلقات کو گناہ سمجھا جائے۔ مشت زنی پاپ ہو، عورت کی قربت کا

خیال تک واصلِ جہنم ہونے کا خطرہ لیے ہوئے ہو، شادی کے بعد بیوی بہنوں اپنے ماں باپ کے پاس رہے، ڈھیروں لوگوں کی وجہ سے تخلیہ میسّر نہ ہو، تخلیہ میسّر ہو بھی تو چارپائی کی چوں چوں کے ڈر سے انسان کچھ نہ کرسکے اور سینکڑوں مرد برسہا برس کی شادی کے بعد بھی نہ بتا سکیں کہ ننگی عورت کیسی نظر آتی ہے۔"

ایسے سماج کو یہ نسل ایک منافق معاشرہ سمجھتی ہے اور اسی منافق معاشرتی ماحول میں پلنے بڑھنے کی وجہ ہی سے

"بہت سے پاکستانی مرد، عورتوں کا دل کی گہرائیوں سے احترام نہیں کرتے۔ وہ VIRGIN سے شادی کرنا چاہتے ہیں مگر جس عورت سے ملتے ہیں اُس کے ساتھ سونا بھی چاہتے ہیں۔"

خالد کے افسانوں میں ایک اور خاص بات اُس کے بیشتر کرداروں کا سیکولر رویّہ ہے۔ ایسے مقامات پر خود اُس کی ہمدردیاں، سیکولر رویے کی ترجمان ہوتی ہیں۔ "نوح کے رشتہ دار" میں بہت ہی سادگی کے ساتھ یہ سوال اٹھایا ہے کہ

"میں نے کسی غیر مذہبی شخص کو لوگوں کے دروازوں پر دستک دیتے نہیں دیکھا اور التجا کرتے نہیں سُنا کہ تم مسجد، گرجا یا مندر مت جاؤ لیکن مذہب کے پیروکار اسے اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ وہ ہر کس و ناکس کے دروازے پر دستک دے کر ہدایت کی تلقین کریں اور اگر لوگ اُن کے مُنہ پر دروازہ بند کر دیں تو مایوس ہو جائیں۔"

یہاں پر خالد کا سیکولر اندازِ فکر غیر محسوس طریقے سے، کرداروں کا ہمنوا بنتا ہوا نظر آتا ہے اور ایسے مقامات، اُس کے کئی افسانوں میں نظر آتے ہیں۔

خالد کے افسانوں میں بہت زیادہ نمایاں نظر آنے والی شخصیت کا تعلق تارکینِ وطن کی اس نسل سے ہے جس کا سامنا، مقامی آبادی سے ہر ہر قدم پر ہوتا ہے۔ اس طرح، کچھ شکوک، کچھ حیرت، کچھ سوالات اور اُن کے جوابات پر چونک جانے کے عمومی رویے جنم لیتے ہیں۔ ایسے سوال جواب کے تانوں بانوں سے، خالد کے افسانے اپنا بنیادی مواد حاصل کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ اُس کے زیادہ تر افسانے مکالماتی ہیں۔ عموماً دو کردار ایک دوسرے سے سوال جواب کرتے ہیں اور بین السطور میں افسانہ نگار اپنے نظریے اور پیغام کی ترسیل کا سامان فراہم کرتا جاتا ہے۔ اس مجموعے کے سترہ میں سے کم از کم نو افسانے اسی مکالماتی تکنیک پر لکھے گئے ہیں۔ یہ انداز ہمارے جدید اردو افسانے کے مجموعی خود کلامی یا سرگوشی والے واضح رویّوں سے ذرا ہٹ کر ہے

ہر چند کہ منفرد نہیں ہے — اس کی ایک وجہ خالد کا ذریعہ روزگار بھی ہو سکتا ہے کیونکہ ماہر نفسیات کی حیثیت سے، اس کا سامنا صبح سے شام تک، اپنے مریضوں سے انٹرویو کی شکل میں رہتا ہے، ممکن ہے ایسا درست نہ ہو مگر وجہ خواہ کچھ بھی ہو اس صورتِ حال سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ بہر حال فکر انگیز اور غور طلب ہوتا ہے۔ "تاریخ کی چکّی کے دو پاٹ"، "الجبرا یا جومیٹری"، "دو باپ"، "جزیرہ" اور دیگر بہت سے افسانے اسی مکالماتی تکنیک پر لکھے گئے ہیں۔ جنوبی افریقہ کے پس منظر میں لکھے گئے ایک افسانے "ریت کے محل" میں سوال وجواب کا یہی انداز اپنے تاثر اور مقصد کی وضاحت کے لیے بڑی چابکدستی سے استعمال کیا گیا ہے — صورت یوں ہے کہ ایک گورا اور ایک کالا بچّہ، ساحل پر ساتھ کھیل رہے ہیں۔

"اتنے میں پولس کا ایک سپاہی اُن کی طرف آیا اور کالے بچّے کو بازو سے پکڑ کر لے جانے لگا۔

"اسے کیوں لے جا رہے ہو — ؟" شون نے پوچھا

یہ کالا ہے اسے یہاں کھیلنے کی اجازت نہیں۔ یہ BEACH صرف گوروں کے لیے ہے۔"

گرینڈ پا! وہ میرے دوست کو لے گیا

"کون بیٹا — ؟"

وہ گندا آدمی

کون سا؟

"پولس آفیسر" کہتا ہے میرا دوست کالا ہے۔"

ہاں بیٹا! شاہین کے بچّے کوّوں کے ساتھ نہیں کھیلا کرتے۔"

"او انڈین — !

تم اس میں نہیں نہا سکتے

وہ کیوں — ؟

تم انڈین ہو

اور یہ بھی تو انڈین اوشن ہے۔

ممی ! یہ کالا لڑکا یہاں کیا کرتا ہے ؟

نوکری کرتا ہے

اسے پولس آفیسر پکڑ کر نہیں لے جاتا۔؟

نہیں بیٹا" اسے صرف کھیلنے اور تیرنے کی اجازت نہیں۔"

سوال وجواب کی اسی تکنیک کے دوران، سہیل کے افسانوں کا ایک اور خاص پہلو، اُس کا گہرا طنزیہ انداز جو مزید اُبھر کر سامنے آتا ہے۔

"کیا تم شادی شدہ ہو ؟

نہیں۔

گرل فرینڈ ہے ؟

نہیں۔

تو تم کیسے زندگی گزارتے ہو ؟

"جڑیں، شاخیں، پھل"

"تمھیں کس قسم کے کتے پسند ہیں ؟

مجھے کتے پسند نہیں۔

وہ کیوں — ؟

وہ نجس اور غلیظ ہوتے ہیں۔

"غلیظ" وانڈا اُچھل پڑی۔" مگر ہم تو اُنھیں صاف ستھرا رکھتے ہیں۔"

جسمانی طور پر نہیں، مذہبی طور پر۔

وہ کیسے — ؟ میں سمجھی نہیں۔

پاکستان میں کتوں کو ناپاک سمجھا جاتا ہے۔ میرے والدین کہا کرتے تھے کہ اگر گھر میں کتا ہو تو رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔

"کتے تو خود انسان کے لیے رحمت کا فرشتہ ہوتے ہیں اور بہترین ساتھی۔"

تمھارے پاکستان میں کس قسم کے کتے ہوتے ہیں ؟۔

"گلیوں کے آوارہ کتے اور پاگل کتے۔"

" ایک پاؤں میں زنجیر"

خالد کا یہی وہ طنزیہ اندار ہے جس کے سبب اُس کے افسانوں میں کڑوے پن، غصے اور

جھنجلاہٹ کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔

"زندگی میں خلا" کے زیادہ تر کردار مغربی معاشرے کے رموز کو سمجھنے کے عمل میں مصروف نظر آنے کے ساتھ ساتھ اُس کے معائب و محاسن کو سمجھانے کا بھی فرض ادا کرتے ہیں۔ اُس نے "پاکی"، "زندگی میں خلا"، "تھکی ہوئی زندگی"، "دو باپ"، "الجبرا یا جیومیٹری" اور "رنگین لیبل کھوکھلے ڈبے" جیسے افسانوں میں، یہاں کی سوسائٹی کے بعض چھوٹے چھوٹے مسائل پر فنکارانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے اور اُس کے اچھے یا بُرے ہونے کا فیصلہ، پڑھنے والے پر چھوڑ دیا ہے یعنی لکھنے والے کی شخصیت بالکل غیر جانبدار رہے۔ اس کے افسانوں میں ایک غیر متعصب نقطۂ نظر ملتا ہے۔ مثلاً "زندگی میں خلا" کی ڈونا کے بارے میں اُس کا رویہ شروع سے آخر تک ہمدردانہ رہا ہے۔ یہ نہیں کہ یہاں کے سینیر سٹیزن کی زندگی کی برائیوں کو گنوا کر تصویر کا صرف ایک ہی رُخ دکھایا ہو بلکہ یہ کہ پورے فریم ورک میں ڈونا کی ریٹائرڈ زندگی کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ اسی طرح "پاکی" میں بھی یہی غیر متعصب رویّہ نمایاں ہے۔

> "چند مقامی نوجوان شراب کے نشے میں ٹورانٹو کی مشہور سڑک ینگ اسٹریٹ کے کونے پر کھڑے بے تکی باتیں کر رہے تھے۔ اسی دوران ایک پاکستانی نوجوان کا جو چرس کے زیرِ اثر تھا، لڑکھڑاتے ہوئے گزر ہوا۔ وہ جب مقامی نوجوانوں کے قریب سے گزرا تو اسے ٹھوکر لگی اور زمین پر گر پڑا۔ وہ سب زور زور سے ہنسنے لگے۔ اس پاکستانی نوجوان کو یہ ادا زیادہ پسند نہ آئی۔ اتنے میں اُسے آواز سُنائی دی۔ اُو پاکی! بے وقوف دیکھ کے چل۔"

یہاں پر ممکن ہے کہ ایک پاکستانی کینیڈین ہونے کے ناطے، وہ اُس پاکستانی نوجوان کو چرس کے زیرِ اثر نہ بتاتا۔ اور اس سارے واقعہ کی ذمہ داری صرف اُن کینیڈین لڑکوں پر ڈال دیتا جو شراب کے نشے میں مست تھے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ یہ غیر متعصب رویّہ، خالد کی تحریروں کو زیادہ با اعتبار بناتا ہے۔

یہاں تک تو بات اس کے غیر جانبدارانہ رویّے کی تھی لیکن اگر غیر جانبداری کی یہ فضا ہر موسم میں یکساں رہے تو معاملہ ذرا مشکوک ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ زندگی کے شب و روز میں جہاں ہر لمحہ خیر اور شر کے درمیان مستقل معرکہ آرائی ہو رہی ہو وہاں، سوچنے والے ذہن کا نہ سوچنا، دیکھنے والی آنکھوں کا نہ دیکھنا اور بولنے والے ہونٹوں کا نہ بولنا، یقیناً انسانیت کا سب سے بڑا جرم قرار پائے گا۔ یہیں سے کمٹ منٹ کا راستہ شروع ہوتا ہے۔ زندگی کے بارے میں ایک مثبت رویہ اور اس کے مسائل کو اپنی تحریروں کا حصّہ بنا کر خالد نے اپنے لیے حقیقت پسندی اور کمٹ منٹ

کی راہ اپنائی ہے۔

اس مجموعے میں چار افسانے ، "ریت کے محل"، "تاریخ کی چکّی کے دو پاٹ"، "آواز کی موت" اور "سفید کانٹوں کی دیوار" وہ افسانے ہیں جو جنوبی افریقہ کے نسل پرست سماج کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ یہ افسانے اپنی ایک واضح نظریاتی اساس رکھتے ہیں۔ ان افسانوں میں خالد ایک مکمل کمٹیڈ ادیب کی حیثیت سے ہمارے سامنے آیا ہے جس میں اس کی پسند اور ناپسند کی ترجیحات پوری طرح نمایاں ہیں۔

خالد کے افسانوں کے اس مجموعے میں، جنوبی افریقہ سے متعلق چار افسانوں کے علاوہ زیادہ تر افسانے اسی سوسائٹی کے مسائل کے گرد گھومتے ہیں جس میں خود افسانہ نگار سانس لے رہا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس مجموعے کی ورق گردانی کے بعد، میری طرح آپ کو بھی یہ فیصلہ کرنے میں دشواری نہیں ہوگی کہ ان ساری تحریروں کے نقشے پر شمالی امریکہ کہاں ہے ——؟۔

ٹورانٹو، ۲۸ مئی ۱۹۸۶ء

ابتدائیہ

آئیں آپ کو ایک کہانی سنائیں۔
یہ آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی
یہ کہانی اس عورت کی ہے جو اب تو ادھیڑ عمر کو پہنچ چکی ہے لیکن میں اسے بچپن سے جانتا ہوں
نام تو اس کا افسانہ ہے لیکن اسے ہمیشہ مصوری کا شوق رہا۔
میں اسے اسکول کے زمانے سے جانتا ہوں جب وہ درختوں، پہاڑوں، چاند اور سورج کی تصویریں بنایا کرتی تھی اور مناظر کا حسن پنسل کی لکیروں سے کاغذ پر اتار لیا کرتی تھی۔ اس کی خفیہ صلاحیتوں کے جوہر سب پر عیاں تھے اس نے مڈل اسکول میں جانوروں اور ہائی اسکول میں انسانوں کی تصویریں بنانی شروع کیں اس کے اساتذہ اس سے بہت خوش تھے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے۔ وہ مردوں، عورتوں اور بچوں کی تصویریں بنایا کرتی اور اپنے اسکول کے مقابلوں میں انعام حاصل کیا کرتی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب وہ دسویں جماعت میں تھی اور اس کی تصویر پہلی دفعہ شہر کی تصویروں کے مقابلے میں بھیجی گئی وہ بھاگی بھاگی میرے پاس آئی اور کہنے لگی "دیکھو یہ پینٹنگ، یہ ماں اور بچے کی تصویر ہے یہ تصویر مقابلے میں شریک ہوگی اور اسکول کی نمائندگی کرے گی" اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا "یہ تو بہت خوبصورت تصویر ہے تم ایک دن بڑی فنکارہ بنوگی"، میں نے حوصلہ افزائی کی اتفاقاً اسی تصویر کو مقابلے میں اوّل انعام ملا۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سمائی۔ اس مقابلے نے اس کی بہت ہمت افزائی کی۔

آہستہ آہستہ اس کی تصویریں دوسرے شہروں کے مقابلوں میں حصہ لینے لگیں اور تھوڑے ہی عرصے میں وہ ملک بھر میں مصوری اور نقاشی کے اہم حلقوں میں پہچانی جانے لگی۔ اس کی عمر تو اٹھارہ برس کی تھی اور ایف اے کی طالبہ تھی لیکن فن مصوری میں وہ بہت سوں کو پیچھے چھوڑ آئی

تھی۔ ملک بھر میں فن کے رسیا اس ابھرتی فنکارہ کے فن کے متلاشی رہتے اور تعریفوں کے پھول نچھاور کرتے۔ اس کا گھر انعامات، اسناد اور ٹرافیوں سے بھر گیا تھا۔ اہلِ خاندان اور دوستوں کے پاؤں مسرت سے زمین پر نہ ٹکتے تھے۔

دھیرے دھیرے اس کی شہرت اور مقبولیت ملک کی سرحدوں کو عبور کرنے لگی اور اسے ایشیا کے دیگر ممالک سے باقاعدہ دعوتیں آنے لگیں اور لوگوں کے تعریفی خطوط موصول ہونے لگے۔ اس کی بین الاقوامی مقبولیت بڑھنے لگی اور دو سال کے قلیل عرصہ میں اس کی تصویریں اور نام ایشیا کے باہر افریقہ، یورپ اور شمالی امریکہ میں پھیلنے لگے۔ بیس برس کی چھوٹی سی عمر میں وہ ترقی کی بڑی بڑی سیڑھیاں عبور کرنے لگی۔ اس کی ایک تصویر کو خصوصی طور پر بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی اس تصویر کا عنوان تھا "خاندان" اس تصویر میں افسانہ نے خاندان کے افراد دکھائے تھے جو جسمانی طور پر تو ایک دوسرے کے قریب تھے لیکن ان کے چہرے کے تاثرات اور سراپا کا انداز ظاہر کر رہا تھا کہ وہ جذباتی اور نظریاتی طور پر ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔ یہ تصویر ہر ملک میں پسند کی گئی۔ وہ شاید صنعتی انقلاب کے خاندان پر اثرات کی حقیقت پسندانہ عکاسی کرتی تھی۔ ایک فنکارہ کا اس نوعمری میں اتنی پختہ تصویر بنانا فن کا معجزہ تھا۔

مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب وہ بین الاقوامی ٹور کی تیاری کر رہی تھی ملک کی آرٹس کونسل نے اس کی نمائشوں کا انتظام کیا تھا اور وہ لندن، پیرس اور نیویارک میں اپنی تصویروں کی نمائش کرنے جا رہی تھی۔ خوشی سے اس کا چہرہ سُرخ اور سانس پھولی ہوئی تھی اس کی آواز تک کپکپا رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور مسکراتا ہوا لوٹ آیا مجھے بھی اس پر فخر تھا۔

وہ تین مہینوں تک یورپ اور شمالی امریکہ کی سیر کرتی رہی۔ مختلف مقامات پر انٹرویو دیئے، رسالوں، اخباروں میں اس کی تصویریں چھپیں، یونیورسٹیوں نے اسے سیریں کرائیں، نوجوان فنکاروں نے اس کے ساتھ شامیں منائیں اور دعوتیں کھائیں۔ اس نے تین مہینوں کی قلیل مدت میں بہت سے تجربات اپنے دامن میں سمیٹ لیے۔

وہ واپس لوٹی تو اس کی ذات میں توانائی کے نئے چشمے ابھرنے لگے تھے اس کے ذہن میں نئے خیالات اور دل میں نئے جذبات موجزن تھے۔ ویسے تو وہ اور بھی بہت سی چیزوں سے متاثر ہوئی تھی لیکن پیرس میں تجریدی فن کے نمونوں نے اس کے ذہن پر بہت اہم نقش چھوڑے تھے۔ وہ اتنی INSPIRE ہوئی کہ اس نے خود تجریدی مصوری کی مشق کرنی شروع کر دی۔

افسانہ نے ایک دفعہ پھر شائقین کو حیران کر دیا۔ وہ تجریدی فن میں بھی ماہر ہونے لگی۔ اس نے چند ہی مہینوں میں تجریدی مصوری کے بہت سے شاہکار تخلیق کیے جو نمائش میں پیش کیے گئے۔ اس

کی ایک تصویر بہت پسند کی گئی جس کے سب کرداروں کے دو چہرے تھے شاید وہ لوگوں کی منافقت کی عکاسی کرنا چاہتی تھی ـــــ پھر اس نے ایک تصویر بنائی جس میں لوگوں کے پاؤں نہیں تھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی تصویریں کہہ رہی ہوں "جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے" روایتی فن کے ساتھ ساتھ افسانہ کے تجریدی انداز کی بھی دنیا بھر میں دھاک بیٹھنے لگی۔

وہ مسرور تھی اور شائقین محظوظ ہو رہے تھے۔

افسانہ بین الاقوامی سین کا مستقل حصہ بنتی جا رہی تھی۔ ہر ماہ کوئی نہ کوئی اخبار یا رسالہ اس سے انٹرویو لینے آتا اس کی تصویریں چھاپتا اور اس کے بدلتے ہوئے نظریات کا جائزہ پیش کرتا۔

یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا افسانہ کا تجریدی فن کے ساتھ شوق جنون کی صورت اختیار کرنے لگا۔

اس نے کبھی ایسی تصویریں بنائیں جس میں انسانوں کے چہرے نہیں تھے۔

کبھی ایسی نقاشی کی جس میں انسانوں کے اعضاء نہیں تھے۔

اس نے جسم کے حصے بکھیر بکھیر دیے حواس خمسہ منتشر ہو گئے بغیر سر کے مرد، بغیر دھڑ کی عورتیں اور بغیر آنکھوں کے بچے بنانے لگی وہ آخر کیا کہنا چاہتی ہے؟ میں سوچتا رہا۔ کیا وہ یہ ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ زندگی میں مرکزیت اور مقصدیت کا فقدان ہو گیا ہے۔ میں یقین سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔

بہر حال جوں جوں اس کے فن میں تجرید کا عنصر بڑھتا گیا اس کی مقبولیت میں کمی آتی گئی۔ لوگ اسے بھولنے لگے۔

ایک طویل عرصے تک میری افسانہ سے ملاقات نہ ہوئی اخباروں اور رسالوں میں بھی اس کی خبر کبھی کبھار ہی نظر آتی۔

افسانہ سے میری ملاقات کچھ عرصہ پیشتر ہوئی میں اس کے اسٹوڈیو میں اس سے ملنے گیا وہ پریشان نظر آئی اس کی دوہری کمر اور موٹی عینک اس کی عمر کی چغلی کھا رہی تھیں اس نے مجھے بڑے خلوص سے گلے سے لگایا لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

ہم کافی دیر تک بچپن کی باتوں اور جوانی کی یادوں سے دل بہلاتے رہے۔

جانے سے پہلے میں نے افسانہ کی پریشانی کا سبب پوچھا تو کہنے لگی "میں پچھلے دنوں ایک بین الاقوامی نمائش میں شریک ہوئی منتظمین نے بیسویں صدی کی چنیدہ چنیدہ اور نمائندہ تصویریں جمع کر رکھی تھیں مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ انھوں نے میری جوانی کی تخلیقات "خاندان" اور "دو چہرے" تو شامل کی تھیں لیکن افسوس اس بات کا ہوا کہ اس کے بعد بنائی ہوئی سینکڑوں تصویروں میں سے ایک بھی موجود نہیں تھی۔" میں لوگوں کی گفتگو سن رہی تھی اکثر لوگ میری موجودگی سے بے خبر

میری تصاویر پر خیال آرائی کر رہے تھے ایک کہنے لگا "افسانہ بہت عمدہ فنکارہ تھی وہ بہت ہر دلعزیز تھی لیکن پھر اس نے ایسی تجریدی تصویریں بنانی شروع کر دیں جو ہماری سمجھ سے بالاتر تھیں چنانچہ اس کی مقبولیت ماضی کا افسانہ بن گئی"، یہ کہتے ہوئے افسانہ کی آواز رندھ گئی۔

"افسانہ تمہارا اس بارے میں کیا تجزیہ ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ مجھ میں میرے فن میں اور میرے چاہنے والوں میں ابلاغ کی اتنی خلیجیں ابھر آئی ہیں کہ ان کو پاٹنا بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے میں اپنے چاہنے والوں سے بہت دور جا چکی ہوں"

"کیا تم دور جا چکی ہو یا بہت آگے نکل گئی ہو کیا یہ ممکن نہیں کہ پچاس، سو سال کے بعد لوگوں پر تمہاری تصاویر کی حقیقت عیاں ہو اگر تمہارے چاہنے والے نہ سمجھ سکے تو ان کے بچے اسے APPRECIATE کریں گے"

افسانہ کچھ دیر تک فضاؤں میں گھورتی رہی پھر بولی "ایسا ممکن تو ہے لیکن نجانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہوگا"

اس کے بعد کافی دیر تک ہم خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

خالد سہیل

نومبر ۱۹۸۵ء

جڑیں، شاخیں، پھل

خاندان بھی درختوں کی طرح ہوتے ہیں۔
جیسے درختوں کی شاخیں جڑوں کو پھلوں سے ملاتی ہیں اسی طرح خاندان ماضی کا مستقبل سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔
کیکٹس اور سیبوں کے درختوں میں کیا فرق ہے؟
ایک پر پھل اگتے ہیں دوسرے پر کانٹے۔
ہجرتوں کے سفر بہت سخت ہوتے ہیں۔
ہجرتوں میں زندہ رہنے والے خاندان یا تو خوش قسمت ہوتے ہیں یا بد قسمت۔
مہاجروں کے بچے غیر معمولی ہوتے ہیں یا تو فنکار بنتے ہیں یا ذہنی خلل کا شکار ہو جاتے ہیں۔
کیا مطلب؟
انھیں ایک طرف تو ماضی کی روایات اور اقدار کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے اور دوسری طرف نئے تقاضوں اور مسائل کو گلے لگانا پڑتا ہے۔ جو کامیاب ہو جائیں وہ فنکار اور جو ناکام ہو جائیں وہ دیوانے بن جاتے ہیں۔
میرے ہمسفر محوِ گفتگو تھے۔
میں عالمِ غنودگی میں کچھ کچھ سن رہا تھا۔
جہاز انگلینڈ سے کینیڈا کی طرف محوِ پرواز تھا۔
میں اپنے تین چھوٹے بھائیوں سے ملنے کینیڈا جا رہا تھا۔ میں جاگا تو مونٹریال پہنچ چکا تھا۔
محمّد مجھے گھر لے گیا اس کی بیوی زبیدہ اور اس کی چودہ اور پندرہ سالوں کی بیٹیوں زینب اور فائضہ سے ملاقات ہوئی۔ میں نے انھیں تحفے دیئے تو فائضہ نے خوشی سے کہا۔ "تھینک یو انکل" محمّد نے "شکریہ تایا جان" کہہ کر ٹوک دیا۔ وہ مرجھا گئی۔
شام کا کھانا کھا رہے تھے کہ محمّد نے بیٹیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "بچیو مغرب کی نماز کا وقت

ہوگیا ہے جاکر وضو کر کے آؤ پھر اکٹھے نماز پڑھتے ہیں۔" زینب تو فوراً اٹھ گئی لیکن فائقہ جو ذرا شریر تھی کہنے لگی "ٹھہر جائیں ابا جان۔ تایا جان کی باتیں ختم ہو جائیں تب پڑھیں گے۔" "واپس آجانا فائقہ مغرب کی نماز کے لیے وقت کم ہوتا ہے۔" اور وہ تلملا کر اٹھ گئی۔

اگلی صبح محمد بہت جلد اٹھ گیا مجھے اس کے غسل خانے جانے کی آواز آئی پھر میں نے محمد کو لڑکیوں کے کمرے کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے سنا "بچیو! فجر کا وقت ہے۔" نجانے کیا ہوا میری پھر آنکھ لگ گئی چونکہ وہ ویک اینڈ تھا اس لیے کسی کو کام پر یا اسکول نہ جانا تھا۔ ناشتے کی میز پر سب بیٹھے تو پتہ چلا کہ فائقہ اٹھ کر دوبارہ سو گئی تھی۔ محمد ناراض تھا۔ فائقہ تم نے نماز قضا کر دی پہلے جا کر نماز پڑھو پھر ناشتہ کرنا۔"

"ابو جان۔ قضا تو ہو ہی گئی ہے ناشتہ کے بعد پڑھ لوں گی۔"

"نہیں تم ہر وقت بحث کرنا شروع کر دیتی ہو۔"

وہ آنکھوں میں آنسو لیے اٹھ گئی وہ میری باتیں سننا چاہتی تھی زبیدہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں احتجاج کیا لیکن محمد کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔

شام کو سب ٹی وی دیکھ رہے تھے کہ فائقہ نے BENNY HILL SHOW لگایا۔ محمد نے فوراً ٹوکا "یہ شخص بہت بے حیا ہے ہر وقت گندے لطیفے سناتا رہتا ہے۔" چنانچہ اس نے اٹھ کر چینل بدل دی جس پر کوئی تاریخی پروگرام تھا۔ فائقہ تھوڑی دیر بعد اٹھ کر چلی گئی۔ میں ایک خاموش تماشائی بن کر سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

شام کے کھانے کے بعد بچیاں سو گئیں تو میں محمد اور زبیدہ گپ لگانے لگے۔

"بچیوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے محمد سے پوچھا۔

"بہت پیاری ہیں زینب بڑی ہے اس لیے سمجھدار ہے۔ فائقہ چھوٹی ہے اس لیے شریر ہے بات نہیں سنتی" پھر کچھ سوچ کر محمد بولا "بھیا بات یہ ہے کہ مجھے کینیڈا آئے دس سال ہو گئے ہیں۔ مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ماحول اسلام کے خلاف ہے اس لیے ہمیں پاکستان سے زیادہ محتاط رہنا پڑے گا تاکہ ہماری بچیاں اسلام اور پاکستان کی اقدار کی روایات سے باخبر رہیں مجھے یقین ہے کہ جب وہ جوان ہوں گی تو ماضی پر فخر کر سکیں گی۔

"آپ کا کیا خیال ہے بھابی؟"

"بات تو ٹھیک کہتے ہیں لیکن بہت سختی کرتے ہیں وہ ابھی بچیاں ہیں ان کے کھیلنے کودنے کے دن ہیں انھیں زبردستی نماز اور قرآن پڑھاتے ہیں بعض دفعہ تو وہ رو پڑتی ہیں۔ بڑی ہوں گی تو خود ہی سمجھ جائیں گی۔"

"ایک دفعہ بُری عادتیں پڑجائیں تو پھر تبدیل کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔" محمد نے بات کاٹی
"تم کہہ رہے تھے یہاں ماحول اسلام کے خلاف ہے میں سمجھا نہیں۔" میں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

"یہ قوم بے راہ رو ہے۔ مذہب سے دُور ان کا بچپن BABY SITTERS کے ساتھ جوانی شراب اور زنا کی لذت میں، ادھیڑ عمر DIVORCES کے سائے میں اور بڑھاپا SENIOR CITIZENS کے گھروں میں گذرتا ہے۔ نہ بڑوں کا ادب نہ بچوں سے پیار۔"

"لیکن پھر بھی یہ قوم ترقی تو بہت کر رہی ہے۔"

"خدا نے ڈھیل دے رکھی ہے۔ ایک دن ان پر عذاب آکر رہے گا۔"

"پھر تم یہاں کیوں رہ رہے ہو۔"

"اس ماحول میں زندہ رہ کر بھی اسلام پر عمل کرنا اور بچوں کو سکھانا بہت بڑا جہاد ہے۔"

میں خاموش ہوگیا۔ میں آخر مہمان تھا۔ اعتراض کرنے نہیں آیا تھا۔ وہ گھر کا مالک تھا جیسے چاہتا اپنی زندگی گذارتا اور بچوں کی نگہداشت کرتا۔

میں نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

اگلے دن میں شہر میں پھرتا رہا۔ میگل یونیورسٹی گیا، کئی گرجوں اور عجائب گھروں، آرٹس گیلیریوں اور بازاروں کی سیر کی۔ مجھے مونٹریال بہت پسند آیا۔ بہت خوبصورت شہر تھا۔ شام کو سینٹ کیتھرین اسٹریٹ کی سیر کی۔ فرانسیسی عورتیں بہت خوبصورت لگیں۔ ایسا لگتا تھا بوڑھی عورتیں بھی اپنا خیال رکھتی ہیں۔ میں نے سوچا۔ ہمارے ہاں جس عورت کی شادی ہوجائے یا عمر تیس برس تک پہنچ جائے وہ اپنی ذات سے غافل ہوجاتی ہے۔ دیکھنے والے کہتے ہیں ؎ ننگِ پیری ہے جوانی تیری۔

موتیے کے پھولوں کو گوبھی کے پھول بنتے دیر نہیں لگتی۔

مجھے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ زینب اور فائقہ بہت پیاری بچیاں تھیں جو میرے ساتھ بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھیں لیکن اپنے والدین کے اعتراضات اور احکام سے مرجھاسی جاتی تھیں۔

شام کے کھانے پر بیٹھے تھے تو فائقہ نے کہا۔" ابوجان ہماری کلاس CAMPING کے لیے جارہی ہے میں بھی جانا چاہتی ہوں۔"

"کتنے لوگ جارہے ہیں؟"۔ محمد نے پوچھا۔

"بیس لوگ سولہ لڑکیاں چار لڑکے۔"

"نہیں پھر تم نہیں جاسکتیں۔ لڑکوں سے جتنا دور رہو اتنا ہی بہتر ہے۔"

"وہ کیوں ؟"

"نامحرم مردوں کے ساتھ وقت گذارنا گناہ ہے۔"

"ابو میری سب سہیلیاں جا رہی ہیں۔"

"میں نے کہا نہیں جانا بات ختم بحث ختم"، محمد کی آواز میں تحکمانہ انداز تھا۔ فائقہ نے بڑے ملتجیانہ لہجے میں اپنی ماں اور میری طرف دیکھا لیکن پھر آنسو لیے خاموش ہو گئی۔

میرا دل تڑپا لیکن مہمان ہونے کی وجہ سے خاموش رہا۔

اگلے دن میں فائقہ اور زینب کو سیر کے لیے لے گیا۔ کھانا کھاتے ہوئے میں نے ان سے پوچھا "کیا تم یہاں خوش ہو؟" ایسے لگا جیسے میں نے سوکھی گھاس کو ماچس کی تیلی دکھادی۔ جذبات کے، بغاوت کے شعلے لپکے۔

"میں ابو سے تنگ آگئی ہوں۔ اسلام اور پاکستان کے نام پر ناٹک زیادہ عرصہ نہیں چل سکتا۔ میرے لیے یہ دونوں الفاظ گالی بن چکے ہیں۔ میرا بس چلے تو آج ہی گھر سے بھاگ جاؤں۔"

"اتنا غصہ کیوں؟"

"نہ ہم گھر سے باہر جا سکتے ہیں نہ اسکول میں میوزک کی کلاسیں اٹینڈ (ATTEND) کر سکتے ہیں اور نہ ہی دوستوں کے ساتھ (CAMPING) میں شریک ہو سکتے ہیں، ابو کہتے ہیں قرآن پڑھا کرو میری سمجھ میں تو بالکل نہیں آتا ان کو بھی عربی نہیں آتی۔ ابا جان کہتے ہیں قرآن میں ہر مسئلے کا حل ہے۔" میں نے پوچھا "مجھے حیض کے ساتھ درد ہوتا ہے۔ اس کا کیا حل ہے۔" تو بہت ناراض ہوئے کہنے لگے "بے حیا بے شرم"

فائقہ کے جذبات برانگیختہ تھے زینب دل ہی دل میں جلا کرتی تھی کہنے لگی۔

"میں ان سے بددل ہو گئی ہوں فائقہ تو شور مچاتی ہے اس سے کچھ فائدہ نہیں۔ میں نے اطاعت اختیار کر رکھی ہے لیکن یہ اطاعت بغاوت سے زیادہ خطرناک ہے۔ اپنی اٹھارویں سالگرہ کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"پھر کیا ہوگا؟" میں متجسس تھا۔

"میں گھر سے رخصت ہو جاؤں گی اور لوٹ کر کبھی نہیں آؤں گی۔"

"اٹھارویں سالگرہ کیوں؟"

"وہ کینیڈا میں بلوغت کی قانونی عمر ہے۔ اس سے پہلے جدا ہونا بہت دردِ سر ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"میری ایک سہیلی سترہ برس کی ہے۔ اس نے عدالت میں جا کر اپنے والدین کو عاق کر دیا ہے۔

اب وہ اپنے ایک رشتہ دار کے ساتھ رہتی ہے عدالت نے ایک LEGAL GUARDIAN مقرر کر دیا ہے جو اس کی نگہداشت کرتا ہے۔"

"والدین کو عاق کر دیا ہے۔" میں نے یہ بات پہلے کبھی نہ سنی تھی۔

"ہاں تایا جان جس طرح والدین بچوں کو عاق کر سکتے ہیں اسی طرح بچے بھی والدین کو عاق کر سکتے ہیں۔ خدا نے پیدا ہونے سے پہلے پوچھا تو نہیں تھا کہ تم اس گھرانے میں پیدا ہونا چاہتی ہو یا نہیں۔ اگر پوچھا ہوتا تو میں انکار کر دیتی؟"

"لیکن تمھارے والدین تم سے محبت کرتے ہیں۔"

"کرتے ہوں گے لیکن جس طرح سے اس کا اظہار کرتے ہیں وہ ہمیں قبول نہیں اگر ہم دونوں بہنیں ایک دوسرے کو سہارا نہ دیتیں تو کب کی خودکشی کر چکی ہوتیں۔"

"کیا میں تمھارے والدین سے بات کروں۔"

"بطخ کی کمر پر پانی پھینکنے یا ریت میں پیشاب کرنے کا کیا فائدہ ہے۔"

"ہمیں خالد اور سہیل چچا بہت پسند ہیں۔ لیکن ابو ان کو کافر سمجھتے ہیں اس لیے ان سے ملنے نہیں دیتے۔ اگر ہمارے ابو بھی سہیل چچا کی طرح ہوتے تو بہت مزا آتا۔

ہم باتیں کرتے ہوئے گھر لوٹ آئے۔

اگلے دن جب بچیاں سو گئیں تو محمد مجھے سیر کے لیے لے گیا ہم TIM HORTON میں چائے پی رہے تھے محمد کہنے لگا "بھیا آپ سے ضروری مشورہ کرنا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"میری دونوں بیٹیاں جوان ہو رہی ہیں۔ خدا کی امانت ہیں چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے کہ وہ گناہ میں ملوث ہوں ان کی منتقی پرہیز گار مسلمان لڑکوں سے شادی کر دوں۔"

میں خاموش رہا۔

"بھیا جب آپ واپس پاکستان جائیں تو اپنی بھتیجیوں کے لیے رشتہ تلاش کرنا شروع کر دیں اگر دو اچھے لڑکے مل جائیں تو میں ان کو لے کر آجاؤں گا اور دونوں کی شادی اسلامی طریقے سے پاکستان میں کر دیں گے۔"

"کیا تم نے اس کا تذکرہ بیٹیوں سے کیا ہے؟"

"اس کی ضرورت ہی کیا ہے بچوں کی فلاح و بہبود ان کے والدین سے زیادہ اور کون جانتا ہے اب ناراض بھی ہوں گی تو بعد میں انھیں حقیقت کا احساس ہوگا۔"

"پھر بھی مشورہ کرنے میں کیا حرج ہے؟"

"جب لڑکے تلاش کرلیں گے تو مشورہ بھی کرلیں گے۔"
مجھے زینب کی بات یاد آئی "ریت میں پیشاب کرنے کا فائدہ۔"
میں خون کے آنسو پی کر رہ گیا۔
اگلے دن خالد سے ملنے نیوفن لینڈ جانا تھا۔

سینٹ جانز کے ہوائی اڈے پر خالد اپنی شوخ سرخ قمیص اور کالی پتلون میں ملبوس مجھے لینے آیا۔ اور اپنی اسپورٹس کار PORSCHE میں مجھے گھر لے گیا۔
اس کا گھر کیا تھا PLAY BOY کلب کا PENT HOUSE لگ رہا تھا چاروں طرف رومانوی پوسٹر اور خوبصورت تصویریں سجی ہوئی تھیں۔ اس ماحول میں وہ سحر تھا کہ عورتوں کا آتے ہی کپڑے اتارنے کو جی چاہے۔ اس پر مستزاد اس کی موسیقی کا چناؤ تھا۔ سونے پر سہاگہ۔
مغرب کے وقت ہم SIGNAL HILL چلے گئے۔
"یہ وہ مقام ہے جہاں سے سب سے پہلے بحرِ اوقیانوس کے اس پار پیغام بھیجا گیا تھا۔ اب یہ ایک تاریخی چوٹی ہے۔" خالد نے مجھے بتایا۔
"سمندر کا منظر بہت خوبصورت ہے۔ لیکن ہوا بہت تیز ہے۔"
"یہاں ہر وقت ہوا چلتی رہتی ہے۔ سمندر کی قربت اور جزیرہ ہونے کی وجہ سے اس میں شدّت پیدا ہو جاتی ہے۔"
باتوں کا رُخ آہستہ آہستہ عورتوں کی طرف مڑ گیا۔
میں نے مذاقاً پوچھا۔ "خالد شادی کیوں نہیں کرتے۔"
"مجھے کالے کتے نے نہیں کاٹا۔ شادی میں رکھا ہی کیا ہے۔ اپنے پاؤں میں زنجیر کون عاقل ڈالتا ہے۔ اپنی قبر خود کھودنے والے کو سمجھدار کتنے لوگ کہتے ہیں۔"
"کیا تمھارے خیال میں سب شادی کرنے والے پاگل ہیں؟"
"اگر پاگل نہیں تو کم فہم و سادہ ضرور ہیں مجھے کینیڈا میں شادی کرنے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔"
"گویا کہ پاکستان میں ہے۔"
"اگر انسان کو شادی کے بغیر عورت کی قربت میسّر نہ ہو تو پھر درویش بر جان درویش شادی کرنی ہی پڑتی ہے اس منافق ماحول میں انسان کر بھی کیا سکتا ہے۔"
"منافق کیسے؟"
"وہ ماحول جہاں جنسی تعلقات کو گناہ سمجھا جائے۔ مشت زنی پاپ ہو۔ عورت کی قربت کا

خیال تک داخلِ جہنم ہونے کا خطرہ لیے ہوئے ہو شادی کرنے کے بعد بیوی مہینوں اپنے ماں باپ کے پاس رہے —— ڈھیروں لوگوں کی وجہ سے تخلیہ میسّر نہ ہو، تخلیہ میسّر ہو بھی تو چارپائی کی چوں چوں کے ڈر سے انسان کچھ نہ کر سکے، اور سینکڑوں مرد برس ہا برس کے بعد بھی نہ بتا سکیں کہ ننگی عورت کیسی نظر آتی ہے۔

کیا تمھارے خیال میں پوری قوم ہی ذہنی طور پر نابالغ ہے۔

اور خود فریبی کا شکار بھی اپنی ہر کمزوری کو ثواب اور ہر بزدلی کو فخر سمجھ کر عمریں ضائع کر دیں۔ جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں۔ مرتے دم تک یہ نہ جان سکے کہ جنسی تعلق بھی کھانے پینے کی طرح ایک فطری خواہش ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کی تسکین اختیاری ہے۔"

"یہاں کیا حال ہے؟"

"حال یہ ہے کہ کوئی خوبصورت عورت نظر آئے اور اس کی تعریف کرو تو شکریہ ادا کرتی ہے۔ جوتا لے کر" تمھاری ماں بہن نہیں" کہتے ہوئے پیچھے نہیں پڑ جاتی اسے فلم یا کھانے پر بلاؤ تو مسکرا کر قبول کر لیتی ہے یا مسکرا کر انکار کر دیتی ہے۔ دعوت قبول کرلے تو ساتھ گھر آجاتی ہے اور ساتھ سونے کے لیے نہ تو غلط عمر بتاتی ہے نہ ہی شادی کے وعدے لیتی ہے، اور نہ ہی ماضی کے معاشقے پوچھتی ہے جنسی تعلق بنیادی طور پر دو انسانوں کا ذاتی تعلق ہے جس میں مذہب یا قانون کو بہت کم دخل ہے۔

"تو پھر یہاں لوگ شادی کیوں کرتے ہیں؟"

خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ اسے زنجیر پا نہیں سمجھتے تعلقات کشیدہ ہو جائیں تو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ اگر طلاق ہو جائے تو رشتہ دار شہر بھر میں بدنام نہیں کرتے۔

گھر لوٹتے ہوئے میں نے گفتگو کا رُخ بدلا۔

"تمھارا مذہب کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"کھٹی میٹھی گولیاں ہیں چونے سے بھری ہوئی ٹوفیاں ہیں چاہے وہ یہودیت ہو عیسائیت ہو یا اسلام۔ غریبوں اور سادہ لوحوں کو بے وقوف بنانے کے طریقے۔"

"اسلام میں کیا خرابیاں ہیں؟"

"مسلمانوں کا حال دیکھو لاکھوں لوگ جو دن رات نمازیں پڑھتے ہیں ان سے پوچھیں جناب "التحیات" کا کیا مطلب ہے تو چغدوں کی طرح منہ دیکھیں گے روزوں میں عام دنوں کی بہ نسبت زیادہ کھاتے ہیں اور اسپتالوں میں معدے کا السر لے کر پہنچ جاتے ہیں زکوٰۃ کوئی دیتا ہی نہیں۔ اور دیتے بھی ہیں تو وہ ۲ ½ فی صد جس کا قرآن میں کہیں ذکر نہیں آیا۔ حج پر بیماری اور بڑھاپے میں جاتے ہیں اور اسہال سے مر جانے پر فخر کرتے ہیں۔ وہاں لاکھوں جانوروں کو اللہ کے نام پر قتل کرتے خوش ہوتے

ہیں، عورتوں کی نافرمانی پر قرآن کے " وَاضْرِبُوْهُنَّ " کا سہارا لے کر پیٹنے کا جواز پیدا کرتے ہیں اس کے علاوہ کتنی باتیں اور سناؤں "۔

" یہ خرابیاں مسلمانوں میں ہیں اسلام میں تو نہیں "۔

" اسلام اور ہے ہی کیا وہ طرزِ زندگی جس پر مسلمان عمل کر رہے ہیں ورنہ اس کا وجود کسی کتاب یا کسی کے ذہن میں ہو تو اس کا کیا فائدہ "۔

شام کو کہنے لگا۔" چلو تمھیں کسی کلب لے چلتے ہیں تاکہ تم اپنی آنکھوں سے یہاں کا رنگانی ماحول دیکھ سکو"۔ پھر جگ بیتی آپ بیتی بن جائے گی۔ میں بھی تیار ہو گیا۔

سینٹ جانز کے ایک کلب ٹہلتے ٹہلتے گئے رات کے نو بج رہے تھے لوگ کلب کے باہر قطاریں بنائے کھڑے تھے ہم بھی کھڑے ہو گئے لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ میں نے پوچھا یہاں دھکم پیل شور غوغا نہیں ہوتا" وہ مسکرایا۔" جو لوگ محبت کرنا سیکھ جائیں وہ لڑائی جھگڑا نہیں کرتے"۔ اُس نے ایک حسینہ کو آنکھ ماری پھر کہنے لگا بعض لوگ تو قطاروں میں کھڑے کھڑے ہی دل ملا لیتے ہیں پھر انھیں کلب میں جانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی اور واپس گھر چلے جاتے ہیں تاکہ خاموشی میں دلوں کی دھڑکنیں سُن سکیں۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد ہم اندر گئے بہت بڑا کلب تھا سیکڑوں نوجوان عورتیں اور مرد۔ عورتیں زیادہ مرد کم —— نیم تاریک ماحول اور پر شور ڈسکو میوزک —— " اس شہر میں ایک مرد کے لیے پانچ عورتیں ہیں۔ گویا کہ پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں، میں انھیں بتاتا ہوں کہ مسلمان مرد کو صرف چار کی اجازت ہے صرف پیغمبر کو خود گیارہ کی اجازت تھی "۔ نہ جانے کیوں خالد کی آواز میوزک کے شور میں دب رہی تھی۔

ہم ایک میز پر بیٹھ گئے تو ایک خوبصورت ویٹرس چلی آئی خالد نے اپنے لیے بیئر اور میرے لیے کوکا کولا لانے کا آرڈر دیا۔ کہنے لگا۔ بھیا آج تو کفر توڑ دیں۔ بسم اللہ پڑھ کر شراباً طہورا پی لیں۔ جنت میں شاید ملے یا نہ ملے۔ ملے گی بھی تو نہروں میں بہتی ہوئی نجانے کتنی صاف ہو گی اور قرآن میں اس کے الکحل کانٹینٹ ALCOHOL CONTENT کا بھی ذکر نہیں آیا۔

میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا لوگ خوش تھے جوانیاں جھوم رہی تھیں۔ مجھے پاکستان کی جوانیاں یاد آنے لگیں۔ جو مفلسوں کی سرد راتوں کی طرح کٹتی ہیں خالد نے دور دو عورتوں کو دیکھا۔ وہ ان عورتوں کو جانتا تھا کہنے لگا۔" بھیا ان عورتوں کو بلاؤں ایک میں لے جاؤں گا ایک تم اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤ ان عورتوں کے ساتھ ایک ایک رات ساری عمر یاد رہے گی ان کے گرم جسم کی حرارت تمھارے نظریات اور اعتقادات کو برف کی طرح پگھلا دے گی "۔

"انھیں بلاؤ گے کیسے؟" میں حیران تھا سوچ رہا تھا کیا یہ میرا ہی بھائی ہے عمر میں کم اور تجربے میں زیادہ۔ میں اس کے آگے طفلِ مکتب ہوں عمر خواب دیکھتے ہی گذر گئی اس کی زندگی کی حقیقتیں میرے خوابوں سے زیادہ رنگین ہیں۔ مجھے اس پر رشک آنے لگا۔

یہ بھلا کیا مشکل بات ہے میں انھیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ جب یہ میرے پیچھے پڑی تھیں میں کسی اور کے پیچھے پڑا تھا۔ آج کل فارغ ہوں تو چلیں کچھ عرصہ ان کی قربت ہی سہی۔ اسی دوران وہاں سے ایک FLOWER GIRL کا گذر ہوا، خالد نے اسے پانچ ڈالر دے کر کہا کہ دو گلاب ان دو حسیناؤں کو دے آؤ۔ ہماری طرف سے تحفہ۔

چند ہی منٹوں میں وہ ہماری میز پر بیٹھی تھیں۔

خالد نے ہمارا تعارف کروایا۔ ایک کا نام شیرن، دوسری کا نام ڈھیبلا تھا۔ خالد شیرن کو ڈانس کے لیے لے گیا اور میں ڈھیبلا سے باتیں کرنے لگا اس کی آنکھوں میں جوانی کا خمار اور جسم میں جذبات کی گرمی تھی جلد ہی بے تکلف ہو گئی پہلے تو خالد کی تعریف کرنے لگی پھر مجھ پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ بتانے لگی کہ اس کی عمر ۳۵ برس ہے ایک بینک کی اسسٹنٹ منیجر ہے اکیلی رہتی ہے۔ شادی شدہ تھی لیکن ۹ سال کے بعد پچھلے سال خاوند سے علیٰحدگی اختیار کر لی۔ میں نے سوچا ایسا موقعہ ہے کہ خود اپنے کانوں سے اس عورت کے حالات سن رہا ہوں۔

تم نے خاوند سے علیٰحدگی کیوں اختیار کی؟ میں متجسس تھا۔

"شادی چند سالوں کے بعد سرد ہو گئی تھی جذبات ٹھنڈے پڑ گئے تھے نہ اس کے قرب میں خوشی نہ اس کے ہجر میں غم۔ ہم بے حسی کا شکار تھے مجھے چند سال پہلے ہی جدا ہونا چاہیے تھا۔ لیکن نہ تو مجھ میں ہمت تھی اور نہ ہی مجھ میں مالی طور پر دم خم تھا میں مدتوں شادی کے کچے دھاگے سے لٹکی رہی اس شادی کو محفوظ کرنا بالکل ایسا ہی تھا جیسے بچہ برف کے ٹکڑے کو محفوظ کرنے کے لیے اپنی ہتھیلی میں دباتا ہے اتنا ہی برف پگھلتی ہے ــــ آخر وہ بالکل ہی پگھل گئی اور پچھلے سال میں نے اسے خدا حافظ کہہ دیا۔

تمھیں جدائی کا بالکل غم نہیں ہوا!

بلکہ خوشی ہوئی ہم علیٰحدہ علیٰحدہ رہتے ہیں کبھی کبھار دوستوں کی طرح ملتے ہیں ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں۔ رومانوی تعلقات، جو کہ ویسے ہی مفقود ہوتے جا رہے تھے، کے علاوہ ہمارے تعلقات بہتر ہو گئے ہیں۔

میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔

ویٹرس کا گذر ہوا تو اس نے ایک اور شراب کے گلاس کا آرڈر دیا۔ اور مجھ سے بھی پوچھا کہ میں

کیا پیوں گا۔ میں نے کہا۔ "کوکا کولا"۔ پوچھنے لگی " رم اور کوک " میں نے جواب دیا۔ "صرف کوک"۔
"تم شراب بالکل نہیں پیتے؟"
"نہیں"۔
"خالد تو پیتا ہے"۔
"ہاں وہ مجھ سے بہت آگے نکل چکا ہے"۔ میں دل ہی دل میں ہنس دیا۔
"اچھی بات ہے ایک بُرائی کم ہے"۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ شراب کو بُرا نہیں جانتی۔ لیکن میرا دل رکھنے کے لیے کہہ رہی ہے۔
"کیا تم شادی شدہ ہو؟" پوچھنے لگی۔
"نہیں"۔
"گرل فرینڈ ہے؟"
"نہیں"۔
"تو پھر تم کیسے زندگی گذارتے ہو؟"
وہ ایسے سوال کر رہی تھی جیسے پوچھ رہی ہو کہ نہ تو گھر پر کھانا پکاتے ہو اور نہ ہوٹلوں میں کھاتے ہو تو پھر زندہ کیسے رہتے ہو میں اسے کیا بتاتا کہ پاکستان میں ہزاروں کیا لاکھوں لوگ اپنے جنسی جذبات کو ایسے بھول جاتے ہیں جیسے سٹھیائے ہوئے بوڑھے اپنی عینک کہیں رکھ کر بھول جاتے ہیں۔
"میں شرمیلا ہوں"۔ میں نے بہانہ تلاش کیا۔
"لگتے تو نہیں"۔ میں جھینپ گیا۔
"آؤ میرے ساتھ ناچو"۔
"میں کبھی نہیں ناچا"۔
"کوئی بات نہیں۔ کسی کو ناچنا نہیں آتا۔ یہ تو ایک طرح کی رومانی ورزش ہے۔
وہ میرا ہاتھ پکڑ کر لے گئی اس کے انداز میں اس قدر اعتماد تھا کہ میں ایک اسکول کے بچے کی طرح اس کی انگلی پکڑ کر چل پڑا۔
ہم کافی دیر تک ناچتے رہے۔ اس کی جوانی کی خوشبو، مسکراہٹ کی حرارت اور لمس کی تپش میرے سراپا میں طوفان کھڑی کر رہی تھیں ایسے لگتا تھا کہ ۴۵ برس کا خوابیدہ آتش فشاں پھٹ پڑے گا۔
کچھ عرصہ بعد وہ میرے سینے سے لگ کر ناچ رہی تھی اور میری گردن کو بوسے دے رہی تھی۔

میری ناتجربہ کاری ظاہر تھی میں اگرچہ ڈاکٹر تھا سیکڑوں عورتوں کو ننگا دیکھ چکا تھا اور ان کے بچے پیدا کرا چکا تھا۔ لیکن اس عورت کو چھونا کچھ اور ہی بات تھی اس کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنے کو جی چاہتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کی زندگی نے اسے ان تجربات سے نوازا تھا۔ جو میں نے لوریاں سنتے گذار دی تھی۔

ناچ کر لوٹے تو کہنے لگی۔ "چلو میں تمہیں اپنے گھر لے چلوں۔ تم بہت پیارے آدمی لگتے ہو۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آرہا تھا۔ پاکستان میں ہوتا تو سوچتا۔ "فاحشہ ہے"۔ لیکن وہ سب کچھ کتنا معصوم اور فطری لگ رہا تھا۔ میں نے بہانہ کیا۔

"میں خالد کے ساتھ آیا ہوں"

"وہ میری سہیلی کے ساتھ مصروف ہے اسے بھلا کیا اعتراض ہوگا۔ میں تمھیں گھر چھوڑ آؤں گی"

میرے انکار کی قوت سلب ہو چکی تھی۔

اس نے خالد اور شیرین کو بلایا اور کہا۔ "خالد میں تمھارے بھائی کو ساتھ لے جا رہی ہوں دلچسپ آدمی لگتا ہے"۔ خالد مسکرایا۔ میں بھی مسکرا دیا خالد نے آنکھ مار کر کہا۔ "عیش کرو"۔

مجھے ڈھینلا اپنے گھر لے گئی۔

اس کا گھر نہایت خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔ اس نے اپنا اسٹیریو لگایا۔

KENNY ROGERS کے گانے لگائے۔ اپنے لیے شراب کا گلاس درست کیا اور مجھ سے پوچھنے لگی "تم کیا پیو گے؟"

"جو تمھاری مرضی"

"اورنج جوس"

"ٹھیک ہے"

اس نے میرے شراب نہ پینے کو قبول کر لیا تھا۔

ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔

اس نے بے اختیار ہو کر میرے ہاتھ اور رخسار چومے ——— لیکن میں برف کا تودہ بنا ہوا تھا ——— یہ نہیں کہ مجھے کبھی عورتوں کی قربت میسر نہ آئی ہو لیکن میرا تجربہ رشتہ دار عورتوں کے ساتھ مقدس تعلقات رفقا کار، نرسوں کو بہن بنا کر بلانے اور لاہور کی داشتاؤں تک محدود تھا ——— ایک خوبصورت عورت کے ساتھ تخلیے میں دوستوں کی طرح وقت گذارنے اور رومانوی ماحول میں قربت سے محظوظ ہونے سے میں قاصر تھا۔ میں جذباتی طور پر قدرے مفلوج تھا ——— میں جانتا تھا کہ

ڈھینلا جانتی تھی کہ میرا تجربہ محدود ہے لیکن اس نے میرے شراب نہ پینے یا اس کے جسم کو نہ چھونے پر میرا مذاق نہ اڑایا۔ آخر میں صرف اتنا کہنے لگی "تم ایک پیارے شخص ہو۔ مجھے بہت پسند ہو اگر چاہو تو رات یہیں رہ جاؤ۔ میرا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ میں شرما گیا زبان گنگ ہو گئی۔ "نہیں شکریہ"، میرا ماضی میرے پاؤں کو زنجیر پہنانے اور جذبات کو شل کرنے کے لیے کافی تھا۔

آخر وہ مجھے واپس گھر لے گئی ایک کاغذ پر اپنا ٹیلی فون نمبر لکھ کر دیا اور کہنے لگی۔ "اگر دل چاہے تو فون کرنا۔ میرے ساتھ وقت گذارنا چاہو تو بخوشی چلے آنا۔ زندگی مختصر ہے کوئی لمحہ واپس لوٹ کر نہیں آتا۔ زیست کا تحفہ وہ لمحات ہیں جو ہم ایسے لوگوں کے ساتھ گذاریں جو ہمیں پسند آئیں مجھے تمھاری مجبوریاں سمجھ میں نہ بھی آئیں پھر بھی قبول ہیں"۔ اس نے مجھے رخسار پر بوسہ دیا اور رخصت ہو گئی۔

میں کافی دیر تک کاغذ کا ٹکڑا لیے دروازے کے باہر کھڑا رہا۔ میری رُوح میں زلزلے آگئے تھے وہ چند گھنٹے یقیناً لائبریری میں سالہا سال گذارنے سے زیادہ قیمتی تھے۔

گھر گیا تو خالد نہیں آیا تھا۔ صبح کے دو بج رہے تھے وہ ساری رات نہ آیا۔

اگلے دن آیا تو کہنے لگا۔ کیوں بھیا شبِ معراج کیسے گذری۔

"پردے درمیان میں حائل تھے"

"جبرائیل کے پر جل رہے تھے۔ مجھے شیرن کی قربت میں لیٹے ان کی بو آرہی تھی۔ ڈھینلا اچھی عورت ہے وہ ہر کسی کو گھر نہیں لے جاتی۔ باقی عورتیں اسے بہت CHO OSY کہتی ہیں تم پر مہربان ہو گئی تھی۔

"وہ بھلا کیوں؟"

"خدا جانے عورتیں تو بادلوں کی طرح ہوتی ہیں وہ بادل جو کبھی تو ہفتوں نہیں برستے اور برستے ہیں تو برستے ہی جاتے ہیں صحراؤں میں نہیں برستے اور دریاؤں میں برس پڑتے ہیں"

"میں عورتوں کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا"

"یہاں کچھ عرصہ رہو گے تو جان جاؤ گے۔ نیوفن لینڈ بہت مخلص جزیرہ ہے۔ عورتیں بہت مہربان ہیں خوب خیال رکھتی ہیں"

"خالد کیا تم کسی کے عشق میں گرفتار نہیں ہوئے؟"

"عشق سراب ہے۔ بچوں کا خواب ہے بالغوں کی زندگی میں اس کا کوئی دخل نہیں"

"کیا عورتیں تمھارے عشق میں گرفتار نہیں ہوتیں؟"

بہت سی۔ لیکن میں انھیں شروع ہی سے کہہ دیتا ہوں کہ اگر انھوں نے بورژوا قسم کی زندگی گذارنی ہے ایک شوہر تین بچوں اور ایک کتے کی امید رکھی ہے تو میرے ساتھ وقت ضائع نہ کریں میری

جوان زندگی میں ان کی کوئی گنجائش نہیں میں نے انھیں زنجیریں نہیں پہنائی اگر انھیں میرے تعلقات پسند نہیں اور میرے نقطۂ نظر سے اختلاف ہے تو پھر رومانوی طور پر ملوث ہونے کی کوئی ضرورت نہیں — اسی لیے بہت سی عورتیں میری دوست ہیں محبوبائیں نہیں۔"

خالد کے ساتھ گذارے چند دن بہت دلچسپ تھے۔

میں خالد سے بہت کچھ سیکھ کر اور بہت سے سوال لے کر آگے بڑھ گیا۔

میرا آخری پڑاؤ ٹورانٹو تھا۔

ہوائی اڈے پر پہنچا تو سہیل بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ خوب خوب گلے ملے مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ "بھیا یہاں مرد مردوں سے گلے نہیں ملتے۔"

"وہ کیوں؟"

"لوگ سمجھتے ہیں کہ ایسی حرکت صرف ہوموسیکشول کرتے ہیں۔"

"تو پھر تم کیوں ملے؟"

"مجھے ان کی کیا پرواہ۔ وہ جو چاہیں سمجھیں اور ہم جو چاہیں کریں۔"

گھر پہنچا تو اس کی بیوی اور بچوں اینڈریو اور جنیفر سے ملاقات ہوئی۔

میں نے تحفے دیئے تو اینڈریو نے "تھینک یو انکل" اور جنیفر نے "شکریہ تایا جان" کہہ کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

سہیل بولا "دونوں جداگانہ مزاج رکھتے ہیں۔ اینڈریو کو انگریزی زیادہ پسند ہے اور جنیفر کو اردو زیادہ بھاتی ہے۔" "بہت خوب۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

شام کو اینڈریو نے مشورہ دیا۔ "ڈیڈی انکل کو ینگ اسٹریٹ لے چلتے ہیں۔" اور ہم سب چل پڑے۔

ینگ اسٹریٹ پر چراغاں ہی چراغاں تھا۔ ہر رنگ و نسل کے لوگ سیر کر رہے تھے ایک طرف صوفی مذہبی پمفلٹ تقسیم کر رہے تھے تو دوسری طرف PUNK اپنے رنگین بالوں کو سنوار رہے تھے ایک کونے پر مرد BUTTONS بیچ رہے تھے تو دوسری طرف عورتیں گاہکوں کا انتظار کر رہی تھیں — وہ رنگینیوں کا مرکز تھا۔

"انکل ینگ اسٹریٹ دنیا کی لمبی ترین سڑک ہے۔" اینڈریو نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔

"اور تایا جان وہ جو CN TOWER نظر آرہا ہے۔" اس نے ایک روشن مینار کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ دنیا کا سب سے اونچا مینار ہے۔" میں بچوں سے سیکھ رہا تھا۔

"جب بھی ڈیڈی یہاں آتے ہیں۔ وہ ہمیں قصہ خوانی بازار پشاور کی باتیں سُناتے ہیں۔ جہاں وہ چپلی کباب کھایا کرتے تھے۔" اینڈریو بولا "ابوجان کو یہاں آکر لاہور کا انارکلی بھی یاد آجاتا ہے جہاں وہ چاٹ اور گول گپے کھایا کرتے تھے۔" جنیفر نے لقمہ دیا۔

"کیا یہاں ایسی چیزیں نہیں ملتیں؟"

"کیوں نہیں۔"

"سہیل! بھیا کو جیراڈ اسٹریٹ لے چلتے ہیں۔ وہاں انھیں کباب کھلائیں گے۔" کیتھی نے مشورہ دیا۔

"چلو چلتے ہیں۔" سہیل راضی ہوگیا۔

چنانچہ ہم جیراڈ اسٹریٹ پہنچ گئے۔ میں ٹورانٹو کے دل میں چھوٹا سا لاہور دیکھ کر بہت حیران ہوا، شلواریں، ساڑیاں، سینما ہال، مٹھائی اور کباب کی دکانیں۔ وہاں سبھی کچھ تھا۔ ہم نے کھانا وہیں کھایا۔

کھانے کے دوران کیتھی نے چاول منگوائے اور انگلیوں سے کھانے لگی۔ میں نے پہلے کبھی کسی گوری عورت کو ہاتھ سے چاول کھاتے نہیں دیکھا تھا۔ بہت محظوظ ہوا۔

"آپ چھری کانٹا استعمال نہیں کرتیں؟"

"میں نے سہیل سے اور بہت سی مشرقی عادات کے ساتھ ساتھ چاول کھانے کا انداز بھی سیکھا ہے۔" وہ مسکرائی۔

"اور میں نے کیتھی سے چھری کانٹے کا صحیح استعمال جانا ہے۔"

میں ان کی باتیں سن کر مسکرا دیا۔

اگلے دن شام کی چائے پی تو جنیفر اور اینڈریو جلدی میں تھے۔

"کہاں کی تیاری ہے؟"

"میں کھیلنے جا رہا ہوں انکل۔"

"کیا کھیلتے ہو؟"

"آئس ہاکی آپ بچپن میں کیا کھیلا کرتے تھے؟"

"کرکٹ۔"

"سنا ہے کہ کرکٹ میں انگلینڈ، ویسٹ انڈیز اور انڈیا بہت اچھے ہوا کرتے تھے؟"

"نیوزی لینڈ بھی بہت اچھا کھیلتا ہے۔"

"یہاں تو لوگ BASE BALL کے عاشق ہیں۔ کرکٹ سے بے خبر۔"

"ہاں وہ انگریزوں کی میراث تھی۔"

"کیا یورپ میں نہیں کھیلی جاتی؟"

"جرمنی میں تو ہٹلر نے قانونی طور پر بین کر دی تھی۔"

"وہ کیوں؟"

"اس نے ایک دفعہ کھیل کا افتتاح کیا۔ پانچ دن بعد پوچھا کون جیتا کہنے لگے DRAW رہا۔ بہت غصے میں آیا۔ حکم ہوا "ایسے فضول کھیل کا جرمنی میں کوئی دخل نہیں۔"

"تم آئس ہاکی میں کیسے ہو؟"

"بُرا نہیں۔"

"اپنے اسکول کی ٹیم میں ہے۔ اچھا کھیلتا ہے۔" سہیل نے تعریف کی۔

"جنیفر تم کہاں جا رہی ہو؟"

"پیانو سیکھنے۔"

"اسے موسیقی سے دلچسپی ہے۔" کیتھی بولی۔

"کیا تمھیں بھی پیانو بجانا آتا ہے۔" میں نے کیتھی سے پوچھا۔

"ہاں میں بچپن میں چرچ میں بجایا کرتی تھی۔ جنیفر کو کبھی کبھار سکھاتی ہوں ایسے لگتا ہے اس میں مجھ سے زیادہ صلاحیت ہے۔"

جنیفر چلی گئی تو میں نے کیتھی سے پوچھا۔ "کیا تم اب بھی چرچ جاتی ہو؟"

"نہیں۔"

"مذاہب کے بارے میں تمھارا کیا نظریہ ہے؟"

"میں مذہبی نہیں۔ لیکن غیر مذہبی بھی نہیں۔ میرے نزدیک سب مذاہب انسانیت کی میراث ہیں اگر ان کے اصول ہماری زندگی کی رہنمائی کر سکیں تو ہمیں ان سے گریز نہیں کرنا چاہیے البتہ RITUALS کی میں قائل نہیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے اسی لیے اگرچہ میں نے مسلمان اور کیتھی نے عیسائی خاندان میں پرورش پائی ہے ہم نے مذہب پر کبھی جھگڑا نہیں کیا۔" سہیل نے وضاحت کی۔

شام کو سہیل مجھے یونیورسٹی کی نلاسفر زلین کی سیر کرانے لے گیا۔ "یونیورسٹی کے انٹلکچول یہاں سیر کرنے آتے ہیں۔"

"سہیل کیا تمھارا ٹورانٹو میں دل لگ گیا ہے؟"

"ہاں بھیا میں نے یہاں کی شہریت اختیار کر لی ہے۔"

"کیا تم اپنی شادی سے مطمئن ہو؟"

"مطمئن ہی نہیں خوش ہوں۔ کیتھی میری بیوی بھی ہے اور دوست بھی۔"

"کیا زبان تمھارا مسئلہ نہیں؟"

"تھا۔ اب نہیں ہے۔ میں نے کیتھی سے بہت سی فرانسیسی سیکھی ہے اور اس نے مجھ سے بہت سی اردو۔ انگریزی تو خیر ہم دونوں ہی جانتے ہیں۔"

"کیا بہت سے پاکستانیوں نے کینیڈین عورتوں سے شادی کی ہے؟"

"نہیں۔"

"کیا وجہ ہے؟"

"بہت سی وجوہات ہیں۔ بہت سے پاکستانی مرد عورتوں کا دل کی گہرائیوں سے احترام نہیں کرتے۔ وہ VIRGIN سے شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن جس عورت سے ملتے ہیں اس کے ساتھ سونا چاہتے ہیں۔"

"یہ تو منافقت ہوئی۔"

"مذہبی نہیں اخلاقی منافقت۔"

"اس کے اثرات کیا مرتب ہوتے ہیں؟"

"یہ تو کوئی ماہرِ نفسیات ہی بتا سکتا ہے۔ جن لوگوں کو میں جانتا ہوں ان کی شادیاں بہت بورنگ ہیں شادی کے بعد وہ ماضی کے سب واقعات اور تجربات کو بھول جانا چاہتے ہیں۔ اپنی بیویوں سے اپنا ماضی چھپاتے پھرتے ہیں۔ اور جب ان کی بچیاں جوان ہوتی ہیں تو انھیں اپنا ماضی HAUNT کرنے آتا ہے اس لیے وہ پاکستان فرار ہونے کی کوشش کرتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ وہ مشرق کے رہتے ہیں نہ مغرب کے ان کی روحیں ماہئِ بے آب بن جاتی ہیں۔"

"تمھارا اپنے بچوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"جان سے عزیز ہیں، دونوں قابل ہیں اینڈریو کو ہاکی اور جنیفر کو موسیقی کا شوق ہے دونوں کو انگریزی، فرانسیسی اور اردو پر قدرت حاصل ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔"

"مجھے بھی پسند آئے۔ کبھی شادی کے بارے میں سوچا ہے؟"

"مجھے پتہ تھا تم یہ سوال ضرور پوچھو گے۔ کیا میں جنیفر کی شادی کسی پاکستانی سے کروں گا یا نہیں۔ یہی سوچ رہے ہو نا؟"

"ہاں"

"بات ایسی ہے بھیا۔ شریکِ زندگی کی تلاش کرنا بڑا ذاتی سا مسئلہ ہے اگر میرے بچے جوان ہو کر اپنے لیے شریکِ سفر تلاش نہیں کر سکتے تو انھیں شادی ہی نہیں کرنی چاہیے۔ اور اگر تلاش کر سکتے ہیں تو انھیں میری مدد کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"کیا خوب کہا ہے تم نے۔"

"ہم ماضی میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ جس شاخ میں لچک نہ ہو وہ بادِ مخالف سے ٹوٹ جاتی ہے۔"

شام کے کھانے کے بعد کیتھی نے ایپل پائی کھلائی بہت لطف آیا میں نے سہیل سے حلوے کی فرمائش کی اس نے وہ بھی کھلایا۔

میں نے اگلے دن واپس چلے جانا تھا۔ اس لیے بچوں کے کمرے میں ملنے گیا۔ اینڈریو کی آواز آئی۔

"جنیفر میں ایک مضمون لکھ رہا ہوں تم سے ایک سوال پوچھنا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"مسجد اور گرجے میں کیا فرق ہے؟"

"ایک میں موسیقی گناہ ہے۔ دوسرے میں ثواب۔"

"میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔"

میں ان کو بھی حلوہ کھلانے لے آیا۔

اگلے دن سہیل، کیتھی اور بچے مجھے ایئر پورٹ پر چھوڑنے آئے۔

میں نے بھیگی آنکھوں سے انھیں الوداع کہا۔

پاکستان کی طرف پرواز کرتے ہوئے کافی دیر تک اپنے بھتیجے بھتیجیوں کی تصویریں دیکھتا رہا۔

مجھے اپنے ہمسفروں کی باتیں یاد آنے لگیں۔

"مہاجروں کے بچے غیر معمولی ہوتے ہیں ....؟"

سیب اور کیکٹس کے درختوں میں کیا فرق ہے؟

میرا دل بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

دسمبر ۱۹۸۴ء

ایک پاؤں میں زنجیر

قتیل اندرونِ شہر پشاور میں پیدا ہوا تھا۔
وہ ان گلیوں میں پلا بڑھا تھا جہاں دن کو بھی سورج کی روشنی اور تازہ ہوا کا گزر نہ ہوتا تھا۔
پیرس کے خیابانِ شانزلیزا پر چہل قدمی کرنا اس کے لیے ایک معجزہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں گاؤں کے اس بچّے کی طرح حیرت کے دیپ مسکرانے لگے جو پہلی دفعہ شہر کے میلے میں گیا ہو۔
"تم بہت حیران لگتے ہو؟"
"میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کسی شہر میں اس قسم کی سڑکیں ہوں گی۔"
"یہ پیرس ہے پیرس۔ جنتِ ارضی۔ یہ خوشبوؤں، موسیقی اور فنونِ لطیفہ کا شہر ہے۔"
قتیل تو حبس زدہ شہر کا پلا ہوا تھا۔ خاموش رہا۔
قتیل اور وانڈا کافی دیر تک اس خیابان کی خوشگوار فضا میں سیر کرتے رہے چلتے چلتے وانڈا ایک پھولوں کی دکان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔
"یہ پھول تمھیں کیسے لگ رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔
"خوبصورت ہیں۔"
"تمھیں کونسے پسند ہیں؟"
"گلاب۔"
"ٹیولپ نہیں۔"
"وہ کونسے ہوتے ہیں۔"
"تمھیں ٹیولپ کا پتہ نہیں۔ ڈیفوڈل کیسے لگتے ہیں؟"
قتیل مسکرا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ آٹھویں جماعت، دسویں جماعت اور بارھویں جماعت کے انگریزی کے کورس میں انھوں نے ورڈزورتھ کی نظم "ڈیفوڈلز" پڑھی تھی لیکن آج تک وہ یہ جان نہ پایا تھا کہ وہ پھول دیکھنے میں کیسے ہیں۔

"میں صرف گلاب، موتیے اور گوبھی کے پھولوں سے واقف ہوں" وہ ہنس دیا
"تم اپنے والدین کو کونسے پھول تحفے میں دیتے ہو؟"
"میں نے کبھی نہیں دیئے"
"اور تمھارے والدین اپنے دوستوں کے لیے کونسے پھول پسند کرتے ہیں؟"
"میں نے والدین کو کبھی پھول خریدتے ہوئے نہیں دیکھا"
اس دفعہ وانڈا کی آنکھوں میں حیرت کے چراغ جلنے لگے۔
چلتے چلتے وہ دریا کے کنارے آ گئے
"شہر کے درمیان یہ کتنا خوبصورت لگتا ہے"
"ہاں یہاں سب فنکار شام کو سیر کے لیے آتے ہیں"
"کیا تم بھی فنکار ہو؟"
"فنکار تو نہیں فنونِ لطیفہ کی طالب علم ضرور ہوں"
"آج کل کیا کر رہی ہو؟"
"یورپ میں فنونِ لطیفہ کی تاریخ پر تحقیق کر رہی ہوں اور تم کیا کر رہے ہو؟"
"میں نے پشاور یونیورسٹی پاکستان سے انجنیرنگ میں ایم ایس سی کیا ہے۔ میرا خصوصی تعلق کمپیوٹرز سے ہے مجھے حکومت نے اسکالرشپ پر بھیجا ہے میں یہاں ریسرچ بھی کروں گا اور ملازمت بھی"
"تمھیں تو فرنچ آتی نہیں ہے"
"کمپیوٹرز کو بھی نہیں آتی"
"چلو آئفل ٹاور کی طرف چلیں"
وہ دونوں ٹاور کی طرف چل پڑے۔
قتیل کو پیرس آئے ابھی چند دن ہی ہوئے تھے اسکا وہاں کوئی جاننے والا نہ تھا یونیورسٹی نے اسے ایک کمرہ دیا تھا اور ایک لیبارٹری تاکہ وہ ریسرچ کر سکے۔ اسی یونیورسٹی میں ایک کیفی ٹیریا تھا جہاں وہ دوپہر کا کھانا کھاتا تھا ایک عورت ہر روز اسی وقت کھانا کھانے آتی تھی۔ ہفتے کے دن وہ ٹرے لے کر اس کی میز پر آ گئی۔
"میرا نام وانڈا ہے اگر اجازت ہو تو آپ کے ساتھ بیٹھ جاؤں"
"ضرور" قتیل اگرچہ شرمیلا تھا لیکن بااخلاق تھا۔
وہ کھانے پر بیٹھ گئی۔

"ایسے لگتا ہے تم اس یونیورسٹی میں نئے ہو۔"

"یونیورسٹی میں ہی نہیں — اس شہر اور ملک میں بھی بلکہ پاکستان سے پہلی دفعہ باہر نکلا ہوں۔"

"تو ابھی تک تم نے پیرس نہیں دیکھا؟"

"نہیں۔"

"میں آج فارغ ہوں اگر چاہو تو پیرس دکھا لاؤں۔"

"بہت اچھا۔"

"تو یہ ہے آئفل ٹاور۔"

"کیسے لگا؟" وانڈا نے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر پوچھا۔

"میں تو بہت مایوس ہوا۔"

"وہ کیوں؟"

"یہ تو کسی مردہ کا ڈھانچہ لگتا ہے۔"

"ہا ہا ہا" وانڈا نے قہقہہ لگایا۔

"پاکستان کا مینار پاکستان اس سے زیادہ خوبصورت ہے۔"

"ہوگا — آئفل ٹاور کی تاریخی اہمیت ہے۔"

"یہ کسی حسینہ کا ایکسرے لگتا ہے۔ ہڈیوں کا پنجر۔ گوشت پوست غائب۔"

"میں نے کسی کو ٹاور کے بارے میں یہ کہتے پہلے نہیں سنا۔"

دونوں مسکرا دیے۔

"قتیل۔ میں نے ایک دوست کے گھر جانا ہے وہ ویکنڈ کے لیے باہر گئے ہیں ان کے کتے کو کچھ کھلانا پلانا ہے اس کے بعد کہیں کھانا کھانے چلیں گے۔"

"بہت خوب۔" قتیل بھی فارغ تھا وہ وانڈا کے ساتھ اس کے دوست کے گھر گیا اس نے ایک بڑا سا کتا دیکھا "یہ پولو ہے" وانڈا نے بتایا "تمھیں کس قسم کے کتے پسند ہیں؟"

"مجھے کتے پسند نہیں۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ نجس اور غلیظ ہوتے ہیں۔"

"غلیظ" وانڈا اچھل پڑی "ہم انھیں صاف ستھرا رکھتے ہیں۔"

"جسمانی طور پر نہیں مذہبی طور پر۔"

"وہ کیسے میں سمجھی نہیں۔"

"پاکستان میں کتوں کو ناپاک سمجھا جاتا ہے میرے والدین کہا کرتے تھے کہ اگر گھر میں کتا ہو تو رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔"

"کتے تو خود انسان کے لیے رحمت کا فرشتہ ہوتے ہیں اور بہترین ساتھی۔"

"پاکستان میں کس قسم کے کتے ہوتے ہیں؟"

"گلیوں کے آوارہ کتے اور پاگل کتے۔"

"تم مذاق کرتے ہو۔"

"نہیں میں سنجیدہ ہوں تمھیں کس قسم کے کتے پسند ہیں۔"

"پہلے میرے پاس ایک کولی تھا، پھر پوڈل۔ آج کل میرے والدین کے پاس ایک جرمن شیپرڈ ہے وہ مجھے بہت پسند ہے۔"

"میں اس معاملہ میں بالکل نابلد ہوں۔"

"تم بہت دلچسپ آدمی ہو۔"

"وہ کیسے؟"

"ایسے لگتا ہے تمھیں کمپیوٹرز کے علاوہ کسی چیز میں دلچسپی نہیں۔"

دونوں ہنس دیے —— قتیل کی ہنسی میں کچھ خجالت اور کچھ تلخی کے سائے لہرا گئے۔

"وانڈا مجھے بھوک لگی ہے کہیں کھانا کھانے چلتے ہیں۔" قتیل نے گفتگو کا موضوع بدلا۔

"کس قسم کا کھانا کھاؤ گے چائنیز، اٹالین یا میکسیکن؟"

"میں کھانوں کے بارے میں بھی زیادہ نہیں جانتا میں تو ساری عمر کری اور چپل کباب کھاتا رہا ہوں۔"

"یہ چپل کباب کیا ہوتے ہیں؟"

"یہ پشاور شہر کی خاص ڈش ہیں وہ قیمے اور مسالوں سے بنتے ہیں اور ان کی شکل چپل کی طرح ہوتی ہے۔"

"کبھی بنا کر کھلانا۔"

"مجھے بنانا نہیں آتے میری ماں نے مجھے کبھی باورچی خانے میں جانے نہیں دیا۔"

"وہ تمھاری سگی ماں ہے یا سوتیلی؟"

"خوب مذاق کرتی ہو۔"

دونوں ہنس دیے۔

" مجھے تو چائنیز وان ٹان سوپ پسند ہے میکسیکن ٹوکیلاز بھی لیکن آج اٹالین سپیگیٹی کھانے کو جی چاہتا ہے۔"

" میں نے کبھی سپیگٹی نہیں کھائیں۔"

" چلو آج کھا لینا۔ پیرس میں رہوگے تو نئے نئے تجربات ہوں گے زندگی کا دائرہ وسیع اور حسین تر ہو جائے گا۔"

" بہت خوب۔"

" صاف پتہ چل رہا ہے کہ تم نے پہلے کبھی سپیگٹی نہیں کھائی۔"

" نہیں۔"

" اسے کھانے کا خاص طریقہ ہے میری طرف دیکھو ایک ہاتھ میں کانٹا دوسرے میں چمچ کانٹے میں سپیگٹی لپیٹ کر چمچ کی مدد سے گھماؤ یہاں تک کہ ساری لپٹ جائے اور پھر منہ میں ڈال لو۔"

" کھانا کھانا بھی ایک فن ہے۔"

" چوپ سٹک سے کھانا تو اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔"

" میں تو ہاتھ سے کھانا کھانے کا عادی ہوں۔"

" وہ بھی ایک فن ہے کبھی موقع ملا تو میں بھی ہاتھ سے چاول کھانا سیکھوں گی۔"

" تم فنونِ لطیفہ کے کس پہلو پر ریسرچ کر رہی ہو؟"

" موسیقی پر۔"

" کس قسم کی موسیقی۔"

" کلاسیکل اور جیز۔"

" یہ جیز کیا ہوتا ہے؟"

" یہ BLACKS نے شروع کیا تھا پہلے صرف مذہبی گروہوں میں مقبول تھا آہستہ آہستہ پورے یورپ اور امریکہ میں مقبول ہو گیا ہے تم کس موسیقی سے حظ اٹھاتے ہو؟"

" ہمارے گھر میں موسیقی ممنوع تھی۔"

" وہ کیوں؟"

" والد صاحب کہتے تھے اسلام موسیقی کے خلاف ہے۔"

" یہ خوب کہا تم نے۔ مذہب موسیقی کے کیسے خلاف ہو سکتا ہے۔"

"کیوں نہیں ؟"

"یورپ میں تو سب مذہبی تقاریب موسیقی کے ساتھ ادا ہوتی ہیں موسیقی تو رُوح کی غذا ہے۔ تم کلاسیکی موسیقی بھی نہیں سنتے انڈیا کی کلاسیکی موسیقی تو بہت روحانی ہے میں روی شنکر کی بہت مداح ہوں وہ اپنی انگلیوں کے پوروں سے دل کے تار چھیڑ دیتا ہے۔"

قتیل مسکراتا رہا اس کی مسکراہٹ زہرخند بنتی جارہی تھی۔ وہ صرف فلمی گانوں اور قوالیوں سے واقف تھا وہ فنِ موسیقی کے بارے میں کیا کہتا۔

اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھرنے لگے پیرس میں اس کا پہلا ہفتہ تھا پشاور سے وہ پہلی دفعہ باہر نکلا تھا اسے زندگی کے بازار میں اپنی حیثیت کا اندازہ ہو رہا تھا اور اپنے ماضی پر نظرِثانی کرنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ وہ وانڈا کے سامنے بھرم رکھنے سے بھی معذور تھا اس کے ماتھے کے قطرے اس کا حالِ دل سنا رہے تھے۔

کھانے کے بعد وہ شام کی سیر کو پھر نکل گئے۔

چلتے چلتے وہ بلوارِ انوالڈ پر آگئے۔ "اسے بلوارِ انوالڈ کیوں کہتے ہیں ؟"

"اس پر بہت سے معذور رہتے ہیں نابیناؤں کے گھر ہیں۔"

قتیل کے جیب میں ایک پیرس کا نقشہ تھا جو اس نے فٹ پاتھ پر بچھا دیا اور گھر کا راستہ دیکھنے لگا۔ وانڈا بھی اپنے پرس میں کچھ تلاش کرنے لگی۔ اتنے میں ایک نابینا لکڑی ٹیکتا ہوا گزرا اور قتیل سے ٹکرا گیا۔ اس نے فرنچ میں کچھ پوچھا۔ قتیل کو کچھ سمجھ نہ آیا۔

"وانڈا یہ کیا کہہ رہا ہے۔"

"تم سے سب وے کا راستہ پوچھ رہا ہے۔"

"میں اس شہر میں نیا ہوں میں راستے نہیں جانتا فرنچ بھی نہیں آتی۔"

"وانڈا نے جب اس کا ترجمہ فرنچ میں کیا تو نابینا مسکرا دیا اور پھر کچھ بولا۔

یہ کیا کہہ رہا ہے ؟ قتیل نے پوچھا۔

"میں تو سمجھا تھا میں ہی معذور ہوں" وانڈا نے ترجمہ کیا۔

قتیل ایک کھسیانی ہنسی ہنس دیا۔

قتیل نے گھر کا راستہ دیکھ لیا تو بولا" اچھا وانڈا اب رخصت ہوتا ہوں پھر ملیں گے۔"

"بڑا دلچسپ دن گزرا گھبراؤ نہیں آہستہ آہستہ پیرس اور اس کے طرزِ زندگی سے واقف ہو جاؤ گے۔ تم پرسوں شام کیا کر رہے ہو ؟"

"کیوں ؟"

"ایک کلاسیکل موسیقی کا پروگرام ہے اگر چاہو تو میرے ساتھ چلنا۔
"بس شکریہ میں نے بہت سا کام کرنا ہے میں بچپن سے شام کو چند گھنٹے کام کرنے کا عادی ہوں۔"
"بہر حال اگر ارادہ بدلا تو فون کر دینا۔"
"شکریہ گڈ بائے۔" "گڈ بائے۔"

قتیل بوجھل قدموں سے گھر لوٹا۔ اس کے کمرے میں ایک خط پڑا تھا اس نے لفافہ کھولا تو وہ اس کی والدہ کا پہلا خط تھا۔

"پیارے بیٹے قتیل

سینکڑوں دعائیں

امید ہے خیریت سے پیرس پہنچ گئے ہو گے۔ ہم سب کو کتنی خوشی ہے کہ تم اپنی زندگی میں کامیاب ہو گئے اور تمھیں پیرس کی یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا ہمیں یقین ہے کہ پشاور یونیورسٹی کی کامیابیاں تمھارا ساتھ دیں گی۔

دیکھو بیٹا تمھاری برسوں کی محنت اور ریاضت آخر پھل لائی تمھارا سارا دن پڑھنا اور رات دیر تک مطالعہ کرنا کامیاب ہوا۔ اگر تم کھیل کود، رنگ رلیوں اور تفریح میں وقت ضائع کرتے تو آج زندگی کی نعمتوں سے محروم رہتے۔

اپنی صحت کا خیال رکھنا۔ دل لگا کر کام کرنا اور اپنی عافیت سے باخبر رکھنا۔
سب گھر والوں کی طرف سے سلام۔

تمھاری

ماں

قتیل نے خط ایک دفعہ پڑھا ـــــ دوبارہ پڑھا ـــــ کافی دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا ـــــ ماتھے سے پسینے کے قطرے پونچھے اور فون اٹھایا۔

"وانڈا میں تمھارے ساتھ موسیقی کا پروگرام دیکھنے چلوں گا۔"

پپاکی

فاطمہ اور بل کی دوستی مشرق اور مغرب کا حسین امتزاج تھی۔

دونوں کی عمر نو برس کے قریب تھی اور دونوں درجہ سوئم کے طالب علم تھے۔ پہلے چھ ہفتے تو دونوں کلاس میں دور دور بیٹھا کرتے تھے لیکن جب سے ان کی استانی نے انھیں ساتھ ساتھ بیٹھایا تھا ان کی دوستی بہت گاڑھی ہو گئی تھی۔

فاطمہ کے والدین کا تعلق پاکستانی پنجاب سے تھا جب کہ بل کے والدین کینیڈا کے صوبہ البرٹا کے رہنے والے تھے دونوں خاندان ٹورانٹو کے نواح میں خوشحال زندگی گذار رہے تھے۔

فاطمہ نازک اور شرمیلی سی لڑکی تھی بل شوخ اور کھلنڈرا لڑکا تھا وہ خود ہی شوخیاں کرتا تھا اور خود ہی محظوظ ہوتا تھا اسے فاطمہ کی سانولی صورت بہت بھائی تھی اور اس سے ہنسی مذاق کیا کرتا تھا۔ فاطمہ پہلے تو شرما جایا کرتی اور اس کا چہرہ شرم سے سُرخ ہو جاتا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ اس کی شوخیوں کی عادی ہو گئی تھی اور اب فقط ہنس دیا کرتی تھی۔

بل کا گھر اسکول سے دور تھا جب کہ فاطمہ اسکول کے قریب رہتی تھی بل اپنے گھر سے جلد نکل آتا تھا اور فاطمہ کو اس کے گھر کے باہر اپنا منتظر پاتا تھا دونوں " ہائے " کہہ کر ایک دوسرے کا استقبال کرتے اور پھر اپنے بستے ہلاتے ہوئے اسکول کی طرف روانہ ہو جاتے۔

اسکول میں وہ دونوں زیادہ وقت اکٹھے گذارنے لگ گئے تھے۔ آدھی چھٹی کے وقت وہ اکٹھے کھانا کھایا کرتے تھے دونوں بچوں کی مائیں ان کے کھانے لنچ بکس LUNCH BOX میں ڈال کر ان کے ساتھ بھیج دیتیں۔ پہلے تو انھیں ایک دوسرے کے کھانے عجیب لگے لیکن اب انھیں عادت ہو گئی تھی بلکہ مزا آنے لگ گیا تھا۔ بل کو اب چپاتیوں اور پراٹھوں کے ساتھ لڈوؤں، برفی اور گلاب جامن کا بھی چسکہ پڑ گیا تھا۔ فاطمہ کو بھی ہاٹ ڈاگ HOT DOG مختلف سینڈوچ اور ٹیونا فش TUNA-FISH کی عادت پڑ گئی تھی۔

بل کو فاطمہ کی سانولی جلد بہت اچھی لگتی تھی اس نے کئی دفعہ فاطمہ سے پوچھا تھا کہ کیا سوچ

میں زیادہ وقت گذارتی رہی ہے اور فاطمہ مسکرا کر کہتی۔ "نہیں میں پیدا ہی ایسے ہوئی تھی" بل کو یقین نہ آتا اور بڑی معصومیت سے اس کے بازو کی جلد چھو کر دیکھتا۔ فاطمہ کو بل کے بھورے بلونڈ بال بہت پسند تھے وہ بھی اس سے پوچھ چکی تھی کہ کیا اس کے بال مصنوعی ہیں بل قہقہہ لگا کر کہتا "ہاں میں نے پانچ ڈالر میں خریدے ہیں"۔

چھٹی ہونے کے بعد دونوں اکٹھے گھر جاتے چونکہ فاطمہ کا گھر راستے میں پڑتا تھا فاطمہ اسے اپنے گھر لے جاتی بل کو فاطمہ کی ماں بہت پسند تھی وہ اس سے پیار سے پیش آتی البتہ بل کی فاطمہ کے والد سے کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ شام کو گھر آتے تھے۔

فاطمہ کئی مرتبہ بل کو اپنے کمرے میں لے جا چکی تھی اور اسے اپنا البم اور ٹیپ ریکارڈ دکھا چکی تھی۔ بل سب سے زیادہ اس کے کپڑوں سے حیران ہوتا تھا۔ وہ شلوار، قمیص، دوپٹہ کو دیکھ کر مسحور ہو جاتا تھا اس کے علاوہ مختلف رنگ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتا تھا۔ آخر ایک دن اس نے فاطمہ کی ماں سے کہا۔ " مجھے آپ کے کپڑے بہت پسند ہیں"۔ فاطمہ کی ماں نے کہا "بیٹا میں تمہارے لیے بھی شلوار، قمیص بنا دوں گی"۔ بل یہ سن کر بہت خوش ہوا تھا۔ اور جا کر اپنی ممی کو بتایا تھا بل کی ممی نے بل کے ذریعہ فاطمہ کی والدہ کا شکریہ ادا کیا تھا۔

دونوں کی دوستی پروان چڑھ رہی تھی۔

کبھی کبھی جب بل شرارت کے موڈ میں ہوتا تو فاطمہ کی چٹیا کھینچتا یا اس کا بستہ لے کر بھاگ جاتا پہلے تو فاطمہ اس کے پیچھے بھاگتی پھر تھک ہار کر بنچ پر بیٹھ جاتی اور روٹھ جاتی۔ اس کے بعد بل اسے منانے آتا لیکن وہ نہ مانتی۔ بل کو اسے منانے کا ایک طریقہ یاد تھا اسے معلوم تھا کہ چیونگم فاطمہ کی کمزوری ہے وہ جب بھی گم پیش کرتا تو فاطمہ مسکرا دیتی اور وہ پھر دوست بن جاتے۔

دونوں کی بے تکلفی بڑھ رہی تھی۔

پہلے تو فاطمہ اور بل ساتھ ساتھ چلا کرتے تھے۔ ایک دن بل نے فاطمہ کا ہاتھ پکڑ کر چلنا شروع کیا۔ فاطمہ پہلے تو کچھ جھجکی لیکن پھر اس کا ساتھ دینے لگی۔ فاطمہ بل کو چھونے سے کترایا کرتی تھی ایک دوپہر بل بھاگا بھاگا آیا اور آتے ہی فاطمہ کو گلے لگا کر چوم لیا۔ فاطمہ ہکی بکی رہ گئی اسے ہوش آیا تو وہ ناراض ہو گئی۔

"تم خفا ہو گئی ہو؟" بل نے پوچھا

"ہاں" فاطمہ نے جواب دیا

"وہ کیوں؟"

"میری امی کہتی تھیں اچھے لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کو نہیں چوما کرتے"۔ بل کی

سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے وہ بھاگ گیا اور دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے لگا۔
ایک جمعہ کو بل نے فاطمہ سے کہا "تم میرے گھر کبھی نہیں آئیں"۔
"تم نے کبھی بلایا بھی نہیں"۔
"کیا تمھاری امّی آنے دیں گی"۔
"میں پوچھ کر بتاؤں گی"۔
"اتوار کو ہمارے گھر کے قریب میلہ ہے اگر آؤ تو جھولا جھولنے چلیں گے"۔
"میں کوشش کروں گی"۔
اور دونوں وعدہ کر کے رخصت ہو گئے۔ رخصت ہوتے ہی انکا اتوار کا انتظار شروع ہو گیا۔

ٹورانٹو کی فضا ایک دفعہ پھر مکدّر ہونے لگی تھی متعصب جذبات ایک دفعہ پھر بھڑک چکے تھے، کبھی تو مہینوں ماحول پُرسکون رہتا اور کبھی چند ہی ہفتوں میں بہت سے ناخوشگوار واقعات پیش آجاتے۔ یہ کیفیت جوڑوں کے درد کی طرح تھی جس میں مہینوں جوڑ صحت مند رہتے لیکن جوں ہی فضا میں رطوبت بڑھتی جوڑوں کا درد بھی عود کر آتا۔

اس ہفتے کے دن ایک واقعہ پیش آیا جس نے حالات کو ابتر کر دیا۔ چند مقامی نوجوان شراب کے نشے میں ٹورانٹو کی مشہور سڑک ینگ اسٹریٹ YONGE STREET کے کونے پر کھڑے بے تکی باتیں کر رہے تھے۔ اسی دوران وہاں سے ایک پاکستانی نوجوان کا جو چرس کے زیر اثر تھا لڑکھڑاتے ہوئے گذر ہوا۔

وہ پاکستانی نوجوان جب مقامی جوانوں کے قریب سے گزرا تو اسے ٹھوکر لگی اور زمین پر گر پڑا۔ وہ سب زور زور سے ہنسنے لگے اِس پاکستانی جوان کو یہ ادا زیادہ پسند نہ آئی وہ سمجھا کہ اس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے اتنے میں اسے آواز سنائی دی۔ "او پاکی PAKI بیوقوف دیکھ کے چل"۔

اس پاکستانی نوجوان کا خون کھولنے لگا اور جواب میں بولا
"بندر کے بچو بکواس بند کرو"۔
یہ سننا تھا کہ وہ اور زور زور سے ہنسنے لگے۔ دوسرا بولا۔ "بے شرم گھر میں بیٹھ کر تماشا کرو۔ سڑکوں پر کیا ناٹک رچاتے ہو"۔
پاکستانی جواب اپنے پاؤں پر کھڑا تھا گرجا "تم کون ہوتے ہو مجھے بتانے والے۔
تیسرے جوان نے اسے دھکہ دیا اور اس نے ان میں سے ایک کا گریبان پکڑ لیا ——

اس کے بعد گالیوں، گھونسوں اور لاتوں کی بارش ہوگئی۔ پاکستانی کا جبڑا اور دونوں نوجوانوں کی ناکیں ٹوٹ گئیں پولیس آگئی لوگ جمع ہوگئے اور انھیں ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ ایک چھوٹی سی بات بڑا حادثہ بن گئی۔

بِل کے والدین ٹیلی ویژن پر خبریں سُن رہے تھے کہ انھوں نے مقامی خبروں میں یہ بات سُنی کہ پاکستانی نوجوان اور کینیڈین جوانوں میں ہاتھا پائی ہوئی۔ پاکستانی نوجوان شراب اور چرس کے نشے میں دھت تھا ایک جوان نے "پاکی بیوقوف" کا فقرا کسا اور اس کے بعد جھگڑا شروع ہوگیا۔

بِل کا والد خود بھی بہت متعصب تھا وہ مذہبی اور نسلی تعصب کا شکار تھا اس کے خیال میں شمالی امریکہ کی تباہی کا سبب یا یہودی ہوں گے یا ایشیائی قومیں اس کی زندگی میں بہت سی تلخیاں تھیں جو ایسے مواقع پر سطح پر آجایا کرتی تھیں۔ اس نے یہ خبر سُنی تو کہا۔ "یہ پاکی بہت ذلیل ہیں ہماری قوم کو تباہ کرنے آگئے ہیں"۔ بِل کی والدہ کو اپنے شوہر کی باتیں پسند نہ تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا شوہر مذہب اور نسلی مسائل کی باتیں کرتے وقت بہت جذباتی ہوجاتا ہے۔ وہ کہنے لگی۔ "قصور جانبین کا تھا"۔ "نہیں" وہ بولا "یہ خارجی ہمارے گھر آکر ہمیں پر دھونس جماتے ہیں۔ ہمیں ان کا سوشل بائیکاٹ کر دینا چاہیے"۔ بِل کی والدہ نے اس آگ کو ہوا دینا مناسب نہ سمجھا اور خاموش ہوگئی۔

اتوار کے دن بِل نے کھانے کے بعد والدین سے کہا

"میں آج سہ پہر میلہ دیکھنے جاؤں گا"۔

"کس کے ساتھ؟" اس کے باپ نے پوچھا۔

"فاطمہ کے ساتھ"۔ بِل مُسکراتے ہوئے بولا۔

"نہیں، تم فاطمہ کے ساتھ میلہ دیکھنے نہیں جاؤ گے"۔ بِل کا باپ جو ابھی تک خبروں سے متاثر تھا تلخ لہجے میں بولا۔

بِل کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔ "آخر کیوں ڈیڈی"۔

"وہ پاکی ہے اور ہمیں اُن سے کچھ لین دین نہیں رکھنا"۔

"پاکی کا کیا مطلب ہے ڈیڈی"۔

"گندے غلیظ"۔

"لیکن فاطمہ تو بہت صاف سُتھری لڑکی ہے ڈیڈی"۔

"او بے وقوف"۔ ڈیڈی کا غصہ بڑھ رہا تھا۔

"لیکن استانی تو کہتی ہیں وہ بہت ذہین ہے۔"
"خاموش رہو میرے ساتھ بحث نہ کرو، مجھے دلیلیں دینے کی کوشش نہ کرو۔ میں نے کہا تم اس سے نہیں ملو گے سمجھے یا نہیں۔"
"اچھا ڈیڈی۔" بل سہم گیا۔
اُس کی ماں نے یہ سب کچھ دیکھا تو بولی۔
"فاطمہ اچھی لڑکی ہے۔"
اس کا باپ غصّے سے کانپ رہا تھا۔
"اب تم بھی اس کا ساتھ دینے لگ گئی ہو میں نے جب کہا ہے "نہیں" تو اس کا مطلب "نہیں"۔"
اس کے بعد وہ اٹھا اور دندناتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔
بل بہت خوفزدہ تھا۔ اس کے چھوٹے سے ذہن میں بہت سے سوال اُبھرے لیکن اس کے پاس ان کا جواب نہ تھا۔ وہ پریشاں خیالی کا شکار تھا۔
شام کو جب فاطمہ مسکراتے ہوئے اس سے ملنے آئی تو وہ بُجھا بُجھا دروازے تک گیا اور بولا۔" فاطمہ میں تم سے نہیں مل سکتا۔"
"آخر کیوں؟" فاطمہ کچھ مُرجھا سی گئی۔
"میرے ڈیڈی نے منع کر دیا ہے کہتے ہیں تم پاکی ہو۔"
"یعنی کیا۔" فاطمہ حیرانگی سے بولی۔
"گندے اور بے وقوف۔" بل نے ڈیڈی کی بات دہرائی لیکن اتنا پژمردہ تھا کہ دروازہ بند کر کے اندر چلا گیا۔
فاطمہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے باہر کھڑی رہی اور پھر آنسو بہاتے ہوئے گھر واپس چلی گئی۔
اُس رات فاطمہ نے اپنے ابّو سے پوچھا۔
"ابّو پاکی کا کیا مطلب ہے؟"
اُس کے ابّو اس سوال پر حیران ہوئے پہلے انھوں نے کروٹ بدلی، سر کھجایا، تھوک نگلا اور پھر بولے:" فاطمہ پاکی کا لفظ پاک سے ہے جس کا مطلب ہے صاف اور ستھرا۔"
فاطمہ نے والد کی بے چینی دیکھ کر مزید سوالات نہ پوچھے اور خاموشی سے کمرے سے نکل گئی۔ اُس کے معصوم ذہن میں سوالات کچھ اور الجھ کر رہ گئے۔

اگلے دن بِل علیحدہ اسکول گیا اور فاطمہ علیحدہ۔ انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا لیکن آنکھیں چُرا گئے۔ ساتھ ساتھ بیٹھے لیکن بات چیت نہ کی۔ دونوں بے قرار اور بے چین تھے لیکن سمجھ نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔

بے چینی آہستہ آہستہ بڑھتی رہی۔

آدھی چھٹّی کے وقت دونوں کے صبر کے پیمانے لبریز ہو چکے تھے ان کی دوستی کا سمندر موجزن تھا۔

بِل خاموشی سے فاطمہ کے پاس آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا:۔

"کیا تم میری دوست ہو؟"

اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں

"ہاں اور تم" فاطمہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بِل نے اُسے گم پیش کی۔ فاطمہ نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی تھام لیا۔

بِل نے رُندھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کاش میرے ڈیڈی ہماری دوستی کو سمجھ سکتے۔" اور وہ محبّت بھری نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

اکتوبر ۱۹۸۳ء

زندگی میں خلا

۱۹۶۰ء

ڈونا کی زندگی مسکراہٹوں اور مصروفیتوں کا حسین امتزاج تھی۔

اس کے صبح و شام اس کشتی کی طرح تھے جو گہرے پانیوں کی سطح پر مستقبل کے طوفانوں سے بے نیاز خراماں خراماں ساحل کی طرف بڑھ رہی ہو۔

وہ خوش خلق عورت تھی اور نیویارک سے باہر متوسط درجے کے ایک مکان میں اپنے شوہر اور جوان بچوں کے ساتھ خوشحال زندگی گزار رہی تھی۔

وہ ہر روز صبح سویرے جاگ جاتی اور خاندان کے لیے ناشتہ تیار کرنے میں ایک خصوصی مسرت محسوس کرتی اس کی بیٹی شیرن بھی اکثر اوقات اس کی مدد کو حاضر ہوتی —— ناشتے کے بعد بچے یونیورسٹی چلے جاتے اور میاں بیوی اپنے اپنے دفتروں میں۔

ڈونا ایک دفتر میں دس سال سے سکریٹری تھی اور ٹام ایک انجنیرنگ کمپنی میں ملازم تھا۔ ان کا بیٹا جم یونیورسٹی میں اکنامکس کا معلم تھا اور بیٹی شیرن پی ایچ ڈی کی طالبہ تھی۔

کام سے فارغ ہو کر وہ سب شام کے کھانے پر جمع ہو جاتے۔ کبھی چٹکلے اور کبھی سنجیدہ گفتگو —— وہ کبھی ایک دوسرے سے بور نہ ہوتے اگر باپ اور بیٹا ان کی مدد کو باورچی خانے میں آتے تو ماں بیٹی ان کی بہت حوصلہ افزائی کرتیں۔

کھانے کے بعد بچے تو کتابوں میں مگن ہو جاتے اور والدین یا تو ٹی وی دیکھنے لگتے یا سیر کو نکل جاتے۔ کبھی کبھار ہمسایوں یا دوستوں سے ملنا بھی انھیں پسند تھا۔

ہر شام شیرن ایک گھنٹہ اپنی موسیقی کے ریاض میں صرف کرتی اور جم ٹینس یا بیڈمنٹن کھیلنے چلا جاتا۔

اس خاندان کے ویک اینڈ مسکراہٹوں سے پر ہوتے۔ اکثر اوقات جم کی گرل فرینڈ اور شیرن کا بوائے فرینڈ بھی آجاتے وہ اکٹھے کھانا کھاتے شراب پیتے اور شیرن کی موسیقی اور گانے سنتے۔

مسکراہٹوں کو قہقہوں کا روپ دھارتے زیادہ دیر نہ لگتی۔

۱۹۶۵ء

زندگی نے اپنا دھارا بدلا۔

شیرن نے پی ایچ ڈی کے بعد شادی کا فیصلہ کیا اور اپنے شوہر کے ساتھ شکاگو چلی گئی۔

ڈونا کو شیرن کی کامیابی اور شادی کی بہت خوشی ہوئی لیکن ....

اسے جلد ہی محسوس ہونے لگا جیسے کسی نے اس کا دستِ راست چھین لیا ہو۔

ایک عجیب کمی تھی جو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

نہ باورچی خانے میں کوئی مدد کے لیے آتا، نہ کھانے کی میز پر کوئی چوتھی کرسی پر بیٹھتا، نہ شام کے وقت کوئی لطیفے سناتا اور نہ اتوار کو کوئی پیانو بجاتا —— ڈونا کے ذہن میں افسردگی کے بادل پھیلنے لگے۔

ایک دن وہ سیر کرتے ہوئے جانوروں کی دکان تک جا پہنچی۔ وہاں کافی ہجوم تھا۔ کوئی بلی خرید رہا تھا تو کوئی کتا، کوئی مچھلی کا شیدائی تھا تو کوئی پرندوں کا۔ وہ ایک کونے میں کھڑی حیران یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی کہ اسے سنائی دیا "کیا حال ہے؟" اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ ایک طوطا تھا جو اسے کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ ڈونا کو وہ بہت سندر لگا۔

مالک نے بتایا کہ وہ بہت سی باتیں کرتا ہے لیکن اس کی قیمت چھ سو ڈالر ہے ڈونا کو اگر کوئی چیز پسند آجائے تو اسے خریدے بغیر اسے چین نہ آتا تھا۔ اس نے اپنے ماسٹر کارڈ پر وہ طوطا خرید لیا۔

مالک نے بتایا کہ اس کا نام شیری تھا۔

ڈونا نے اس کا پنجرہ اپنے باورچی خانے میں ٹانگ دیا۔

اس کے بعد باورچی خانے میں شیرن تو نہ تھی لیکن شیری دل بہلانے کو تیار رہتی۔

ڈونا ناشتہ تیار کرتے وقت شیری سے باتیں کرتی، شام کو اس کا حال پوچھتی اور اتوار کو اور بھی زیادہ وقت گزارتی۔

شیری اور ڈونا جلد ہی ایک دوسرے سے مانوس ہو گئے۔

۱۹۷۰ء

زندگی نے ایک اور کروٹ بدلی۔

جم کو کیلی فورنیا میں ایک عمدہ ملازمت کی پیش کش ہوئی جم کیلی فورنیا کا دلدادہ تھا چنانچہ اس نے وہ نوکری قبول کر لی اور نیویارک چھوڑ کر بہت دور جا بسا۔

ڈونا اور ٹام گھر میں تنہا رہ گئے۔

انھیں شادی کے ابتدائی دن یاد آنے لگے ــــ لیکن کسی چیز کو پا کر گنوا دینا زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔

وہ گھر جس میں قہقہے گونجا کرتے تھے خاموشی کے سائے منڈلانے لگے۔

کئی دفعہ گھنٹوں گزر جاتے اور وہ بات تک نہ کرتے۔

کھانے کی میز بھی خالی خالی نظر آتی۔

ڈونا کے لیے ۱۴ مئی کا دن خصوصی تھا وہ دفتر گئی تو رفقاء کار نے ایک تقریب کا اہتمام کر رکھا تھا وہ اس کا جنم دن تھا۔ انھوں نے اسے ایک پودا PRAYER PLANT بطور تحفہ دیا۔ ڈونا بہت مسرور تھی اس نے اسے اپنی میز پر لا کر سجا دیا اسے وہ پودا سارا دن دست بہ دعا نظر آتا تھا۔

ڈونا اب زیادہ وقت شیری اور پودے کے ساتھ گزارنے لگی تھی۔ پودے سے انس بڑھا تو اس نے دس بارہ اور پودے خرید لیے۔

وہ دن رات ان سے باتیں کرتی انھیں موسیقی سناتی اور ہر لحاظ سے ان کی سیوا کرتی۔

ٹام گھنٹوں اسے انھی کاموں میں مصروف پاتا۔

ڈونا اور ٹام اب بھی سیر یا فلم کے لیے کبھی کبھار جاتے لیکن بجھے بجھے نظر آتے۔

شروع میں تو بچے والدین کی حوصلہ افزائی کے لیے خط لکھتے رہے لیکن آہستہ آہستہ ان خطوط کی رفتار میں کمی آنے لگی وہ شاید پودوں اور شیری کی باتیں سنکر زیادہ محظوظ نہ ہوتے تھے۔

ڈونا کے چہرے پر بہت سی جھریاں پڑ گئی تھیں۔

۱۹۷۵ء

زندگی نے ایک اور پہلو بدلا۔

ڈونا اس کبوتر کی طرح تھی جو بلی کو دیکھ کر آنکھیں موند لیتا ہے۔

ڈونا نے آنکھ کھولی تو وہ اپنی زندگی کی پینسٹھویں سیڑھی پر تھی اور ریٹائرمنٹ کی بلی نے اس کی گردن پر دانت رکھے ہوئے تھے۔

وہ دفتر والوں کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ کر گھر لوٹ آئی۔

وہی گھر جس کے لیے وہ ترسا کرتی تھی اب اسے کاٹنے کو دوڑنے لگا۔

وہ دن بھر اپنی اداسیوں سے ہمکلام رہتی۔

ڈونا کا دل نہ تو صبح اٹھنے کو اور نہ ہی ناشتہ کرنے کو چاہتا، نہ بستر سے نکلنے کو من ہوتا اور نہ دوپہر کو کھانا کھانے کی طبیعت چاہتی۔ وہ سہ پہر کے وقت اٹھتی، شیری سے باتیں کرتی، پودوں کی نگہداشت کرتی اور شام کا انتظار کرنے لگتی۔ شام آتا تو وہ کھانا کھاتے اور کبھی کبھار سیر کو چلے جاتے۔

کئی ہفتوں کے بعد ایک شام وہ خریداری کے لیے گئی تو اس کی نظر ایک ٹی وی کی دکان پر پڑی وہاں اسکرین پر رقص ہو رہا تھا وہ اس میں اتنی محو ہوئی کہ تقریباً گھنٹہ وہیں کھڑی رہی دکاندار نے دکان بند کرنی چاہی تو اسے وقت کا احساس ہوا۔

اس نے ایک اور کھلونا ٹی وی خرید لیا اور اپنی خوابگاہ میں سجا دیا۔

ٹی وی آنے کے بعد اس کے معمول میں نمایاں فرق آگیا تھا۔

صبح اٹھتے ہی وہ بٹن دباتی اور دوپہر تک دیکھتی رہتی شام کو پھر چند پروگراموں سے محظوظ ہوتی اور رات گئے تک اسکرین سے چپکی رہتی۔

اب وہ گھر کے کاموں سے بھی غفلت برتنے لگی تھی۔

مہینے میں ایک مرتبہ وہ پنشن لینے چلی جاتی۔

جنوری ۱۹۷۷ء

زندگی کے سمندر میں طغیانی پیدا ہوئی۔

وہ سطح جو بہت خاموش تھی بھنور کی صورت اختیار کرنے لگی۔

ڈونا کی کشتی جو مستقبل سے بے نیاز آگے بڑھ رہی تھی اچانک گرداب کے درمیان میں آگئی۔

ایک صبح جب ڈونا جاگی تو شام نے گرم بوسے کی بجائے سرد جسم سے اس کا استقبال کیا اس نے شام کو بہت جھنجھوڑا لیکن بے سود۔ اس نے ایمبولینس بلائی اور اسے ہسپتال لے گئی۔ شام اپنے جسم کے ساتھ ساتھ ڈونا کو بھی دائمی الوداع کہہ گیا تھا۔

ڈونا نے شیشے کی جس ٹوکری میں زندگی کے سب انڈے سنبھال کر رکھے تھے وہ گر کر چکنا چور ہو گئی۔

اس نے رونا چاہا لیکن اس کے آنسو خشک ہو گئے تھے۔

اس کے بچے چند دن کے لیے آئے لیکن اپنی مجبوریوں کی وجہ سے واپس چلے گئے۔

ڈونا نے ایک کتا خرید لیا جس کا نام شون تھا۔

چند مہینوں کے طوفان کے بعد ڈونا ایک نئی سطح پر زندگی گزارنے لگی۔

اس کے صبح و شام ایک دفعہ پھر بظاہر خاموشی اور سکون سے مالا مال ہو گئے۔

وہ صبح چھ بجے اٹھتی ـــــ ٹی وی کا بٹن دباتی ـــــ دو گھنٹے پروگرام دیکھتی ـــــ پھر شیری سے باتیں کرتی ـــــ ناشتہ کھاتی ـــــ پودوں کی گھنٹوں سیوا کرتی ـــــ پھر ٹی وی دیکھتی ـــــ شام کو شون کو سیر کے لیے لے جاتی ـــــ رات کا کھانا کھاتی ـــــ پھر ٹی وی دیکھتی اور کتے کو لے کر اونگھتے اونگھتے سو جاتی۔

اس کی تمام تر خریداری ٹیلی فون کے ذریعے ہوتی۔

زندگی کی گاڑی خراماں خراماں آگے بڑھ رہی تھی۔

نومبر ۱۹۷۷ء

چاروں طرف گھرے بادل چھائے ہوئے تھے۔

ڈونا جب مہینے کی دس تاریخ تک پنشن لینے نہ آئی تو اس کے سوشل ورکر مسٹر واکر کو فکر لاحق ہوا۔ ڈونا نے کبھی دیر نہ کی تھی۔

اس نے کئی دفعہ فون کیا لیکن جواب ندارد۔

آخر وہ اس کی خیریت پوچھنے گھر آیا لیکن دروازہ بند پایا۔

جب دروازہ کھلوایا گیا تو مسٹر واکر حیرانگی میں کھو گیا۔

ڈونا اپنے بستر پر لیٹی موت کی آغوش میں سو رہی تھی اس کی آنکھیں کھلی تھیں جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہوں۔ ٹی وی پر فلم چل رہی تھی۔

اس کے گھر میں پودے، پرندے اور جانور تو تھے لیکن انسان نہیں تھے۔

۱۹۸۱ء

تھکی ہوئی زندگی

ولیم کا سٹریچر کلینک میں ایسے داخل ہوا جیسے اس کی زندگی کا ہوائی جہاز طویل مسافت کے بعد رن وے پر لینڈ کر رہا ہو۔

اس نے ویٹنگ روم میں چاروں طرف دیکھا۔ موت کی پرچھائیاں پوسٹروں کی صورت میں اس کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ "موت زندگی ہے۔"

"زندگی کی انتہا موت ہے۔"

"صرف ان لوگوں کو زندہ رہنا چاہیے جو زندہ رہنا چاہتے ہوں۔

باعزت زندگی کے لیے DIGNIFIED DEATH CLINIC

(DDC) کی طرف رجوع کیجیے۔

اس کی اپوئنٹ منٹ میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ ولیم کی پرائیویٹ نرس شیرن اس کے ساتھ آئی تھی۔ ولیم کے سراپا میں اس کی زندگی کی تھکاوٹ پھیل چکی تھی۔

وہ شیرن کا سہارا لیتے ہوئے اسٹریچر پر بیٹھ گیا۔

"مجھے DIGOXIN کی گولی دینا۔"

"وہ تو تم آدھ گھنٹہ پہلے کھا چکے ہو۔"

"اور پیشاب کی گولی۔"

"وہ تو تم صرف پیر، بدھ اور جمعہ کو کھاتے ہو اور آج ہفتہ ہے۔"

"شیرن تم بہت مہربان ہو۔" اس کی روح کا تمام تر درد اس کی آنکھوں میں سمٹ آیا۔

"اکثر نرسیں مہربان ہی ہوتی ہیں۔" شیرن نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

"مجھے کچھ پانی پلاؤ۔"

شیرن اسے ایک گلاس لا کر دیتی ہے اور پینے میں مدد کرتی ہے۔

"شیرن میں ہر چیز بھول کیوں جاتا ہوں؟"

"زندگی کے اس دور میں بہت سے لوگ اپنی یاداشت کھو بیٹھتے ہیں"

"میں نہ پڑھ سکتا ہوں نہ لکھ سکتا ہوں نہ سوچ سکتا ہوں زندگی ایک بار بنتی جا رہی ہے اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی"

شیرن خاموش رہتی ہے۔

ویٹنگ روم میں نرس داخل ہوتی ہے۔

"میرا نام مانیکا ہے۔ میں ڈگنیفائڈ ڈیتھ کلینک کی رجسٹرڈ نرس ہوں۔ آپ کا نام؟"

"ولیم"

"تاریخ پیدائش؟"

"یاد نہیں تقریباً پچتر سال کا ہوں"

"آپ کا پتہ؟"

"اسی شہر میں رہتا تھا اب تو آپ کا کلینک ہی میرا پتہ ہے"

"آپ کا سوشل انشورنس نمبر؟"

"میرے بریف کیس میں ہے"

"کیا آپ وصیت لکھ چکے ہیں؟"

"ہاں میرے وکیل کے پاس ہے"

"آپ کی انشورنس"

"اس کا بھی انتظام ہو چکا ہے"

"کیا آپ اپنے کسی دوست یا رشتہ دار کو خط یا تار بھیجنا چاہتے ہیں؟"

"نہیں"

"کیا آپ کسی چرچ کے پادری کو مطلع کرنا چاہتے ہیں؟"

"نہیں شکریہ"

"آپ کتنی دوائیں کھاتے ہیں"

"ایک گولی دل کے درد کے لیے،
ایک گولی گردوں کے لیے اور
ایک گولی ضعفِ جگر کے لیے"

"ان کے علاوہ کوئی اور علاج کرواتے ہیں"

"ہر تین مہینے کے بعد ڈایالسز DIALYSIS کرواتا ہوں"

"آپ کا جو علاج یہاں ہوگا اس کا خرچ کون ادا کرے گا؟"

"میری انشورنس کمپنی۔ معاف کرنا نرس تمھارا نام کیا ہے میں بھول گیا"

"مانیکا"

"ولیم اس کلینک میں مرنے کے تین طریقے ہیں۔ تین منٹ کا، تین گھنٹوں کا اور تین دنوں کا۔ آپ کونسا طریقہ پسند فرمائیں گے؟"

"مجھے پہلے یہ بتاؤ کہ میرے مرنے کے بعد میرے جسم کا کیا کریں گے"

"جو آپ پسند فرمائیں۔ کیا آپ دفن ہونا چاہتے ہیں، جلنا چاہتے ہیں یا اپنا جسم سائنس کی تحقیق کی نظر کرنا چاہتے ہیں؟"

"کیا میرے جسم کا کوئی حصہ کسی کے کام آسکتا ہے؟"

"آپ کی آنکھیں"

"سنا ہے میرا خون جو کہ اونیگیٹیو (-O) ہے وہ بھی ریسرچ کے کام آسکتا ہے"

"درست ہے"

"تو ایسا انتظام کرنا کہ میری آنکھیں اور خون لینے کے بعد باقی جسم جلا کر بحر اوقیانوس میں اس کی راکھ پھینک دینا۔ کیا تین منٹوں یا تین گھنٹوں میں مرنے سے اس پر کچھ اثر پڑے گا"

"ہاں اگر تین گھنٹوں میں مرو گے تو تمھارے اعضا سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے گا"

"تو پھر تین گھنٹوں کا علاج ٹھیک ہے"

"کیا تم گھر میں اکیلے رہتے تھے"

"ہاں۔ لیکن میری پانچ پرائیویٹ نرسیں ہیں جو ایک ایک ہفتہ میرا خیال رکھتی تھیں آج کل میرے ساتھ شیرن ہے"

"کیا تم مرتے وقت شیرن کو اپنے کمرے میں رکھنا چاہو گے؟"

"ضرور"

"میں یہ سب کچھ لکھ کر لے آؤں گی تاکہ تم دستخط کر سکو اور اس کی قانونی حیثیت ہو جائے"

"بہت خوب"

"تم کب مرنا چاہو گے؟"

"کل شام"

"بہت خوب۔ ولیم اس کلینک میں ایک محکمۂ نفسیات کی ٹیم ہے جو موت وحیات کے

موضوع پر ریسرچ کر رہی ہے۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو وہ تمھارا انٹرویو لے لیں۔"
"ضرور۔ انھیں اندر بھیج دو۔ لیکن سنو نرس تمھارا نام کیا ہے؟"
"مانیکا۔"

"میں رابرٹ ہوں اور یہ سنتھیا ہے۔ ہم محکمۂ نفسیات کے طلبا ہیں آپ سے کچھ سوال پوچھیں گے۔"
"ضرور میں بھی دس سال فلسفہ پڑھتا رہا ہوں۔"
"آپ مرنا کیوں چاہتے ہیں؟"
"میں زندگی سے تھک چکا ہوں۔ ایک وقت تھا میں زندگی سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ اب وہ میرے کندھوں پر بوجھ بن گئی ہے اور میں دوسروں کے کندھوں پر بوجھ بن گیا ہوں۔"
"کیا آپ اپنے پیچھے دنیا میں کچھ چھوڑے جا رہے ہیں؟"
"ہاں میں نے پانچ کتابیں لکھی ہیں جو فلسفے کے نصاب میں پڑھائی جاتی ہیں یہی میری اصل وراثت ہے۔"
"آپ نے زندگی میں سب سے زیادہ مشکل کیا پایا؟"
"الوداع کہنا۔ لیکن جب میں الوداع کہنا سیکھ گیا تو زندگی کو الوداع کہنے کا وقت آگیا۔"
"کیا آپ کو زندگی سے کوئی شکایت رہی ہے؟"
"نہیں۔"

"ولیم میرا نام ڈاکٹر سمتھ ہے کیا تم تیار ہو؟"
"بالکل۔"
"ہم دو طرح کی گیس استعمال کرتے ہیں موت کو پرسکون بنانے کے لیے ایک سے انسان مسکرا پڑتا ہے دوسری سے رو دیتا ہے۔ تم کونسی پسند کرو گے؟"
"مسکرانے والی۔"
"ہم تمھیں نشہ آور ادویہ کے کمرے میں لے چلیں گے اور تمھارے پاس صرف شیرن ہوگی۔"
"بہت خوب۔"

"شیرن میں تھک گیا ہوں۔ اب مجھے نیند آرہی ہے۔"

"میرے ماتھے پر بوسہ دو۔ گڈ بائے!"

دلیم کی راکھ بحرِ اوقیانوس کی سطح پر بکھرتی ہے اور اس کی تہہ میں بڑے سکون سے بیٹھ جاتی ہے۔

بحرِ اوقیانوس کے ساحل پر بہت سے طلبا، اس واقعہ سے بے خبر دلیم کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھ رہے ہیں۔

اپریل ۱۹۸۵ء

جزیرہ

کیا تمھارے والدین زندہ ہیں ؟
ہاں۔
آخری دفعہ ان سے کب ملے تھے ؟
دس سال پہلے۔
تمھارے بہن بھائی ہیں ؟
ہاں۔
ان سے آخری بار کب ملاقات ہوئی تھی ؟
سات برس پیشتر۔
کہاں ملے تھے ؟
راستے میں ملاقات ہوگئی تھی۔
کیا تمھارے دوست ہیں ؟
کوئی نہیں۔
کیا تمھارا گھر ہے ؟
نہیں۔
کہاں رہتے ہو ؟
جہاں رات ٹھہر جائے۔
تمھاری آمدنی کا ذریعہ کیا ہے ؟
کوئی نہیں۔
توتم زندہ کیسے ہو ؟
بس زندہ ہوں۔

تم کب سے اس طرح زندگی گزار رہے ہو ؟
تقریباً بارہ برس سے ۔
تم زندگی میں کیا کرنا چاہتے ہو ؟
کچھ بھی نہیں ۔
تمھاری زندگی کا مقصد کیا ہے ؟
پتہ نہیں ۔
کیا تمھارے لیے ویلفیر کا انتظام کروں ؟
اس کی کوئی ضرورت نہیں ۔
رہائش کا انتظام ؟
اس کی بھی حاجت نہیں ۔
تمھیں کھانے پینے کے لیے کچھ رقم کی ضرورت ہوگی ؟
نہیں ۔
کیا ہم کسی طریقے سے تمھاری مدد کر سکتے ہیں ؟
نہیں بہت بہت شکریہ ۔
میری سوشل ورکر کے کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا کرے ۔

اس شخص کو پولیس ہسپتال لے آئی تھی تاکہ اسے داخل کر لیا جائے کیونکہ وہ بہت کمزور وناتواں تھا گلیوں بازاروں میں سوتا تھا بھوکا پیاسا رہتا تھا۔ چونکہ سردی کا موسم آگیا تھا اس لیے پولیس پریشان تھی کہ کہیں وہ سردی سے اکڑ کر مر نہ جائے ۔

"ڈاکٹر صاحب اسے، داخل کر لیں تاکہ اس کی صحت بہتر ہو سکے ۔" پولیس مین نے مشورہ دیا۔

"کیا تم ہسپتال میں داخل ہونا چاہتے ہو ؟"
"نہیں میں بیمار نہیں ہوں ۔"
میں ڈاکٹر ہو کر بھی بے بسی کے دریا میں ڈوب گیا ۔
میری سوشل ورکر نے اس کے والدین کو اطلاع دی اور وہ اسے گھر لے گئے ۔
دو دن کے بعد پولیس اسے دوبارہ لے آئی ۔
مسئلہ پھر وہی تھا ۔
اس دفعہ سوشل ورکر نے اسے اس کی بہن کے پاس بھیج دیا۔

یہ حل بھی ایک ہفتے سے زیادہ کام نہ آسکا۔

پولیس کا اصرار تھا کہ اس شخص کا ذہنی توازن درست نہیں اس لیے اسے چند مہینوں کے لیے پاگل خانے داخل کرنا چاہیے لیکن میں متفق نہیں تھا۔

میرے نزدیک مسئلہ اس کا نہیں تھا پولیس کا تھا جو شہر میں ایک ایسے شخص کو برداشت نہ کر سکتے تھے جو روایتی انداز سے زندگی گزارنا نہ چاہتا تھا۔

اس دفعہ سوشل ورکر نے اسے ایک بورڈنگ ہوم میں بھیجا۔ پولیس نے اسے تنبیہ کی کہ اگلی دفعہ اگر وہ شہر کی گلیوں میں سوتا ہوا پایا گیا تو اسے جیل میں بند کر دیا جائے گا۔ وہ بے اعتنائی سے مسکرا دیا۔

ایک باپ بیٹا صبح کی سیر کرنے شہر کے باہر گئے تو بچّے کو تالاب میں کچھ تیرتا ہوا نظر آیا۔ اس نے اپنے باپ کو بتایا تو اندازہ ہوا کہ وہ لاش تھی۔ ایمبولینس اس لاش کو لے کر آئی۔ میں لاش کو دیکھ رہا تھا اور پاس ہی وہ بچہ کبھی مجھے اور کبھی اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا اس کی نگاہوں میں حیرانی کے دیے ٹمٹما رہے تھے۔

"ابو"

"جی بیٹا"

"ابو میرے ٹیچر نے بتایا تھا کہ جس چیز کے چاروں طرف پانی ہو اور زمین سے تعلق نہ ہو وہ جزیرہ ہوتا ہے۔"

"ہاں بیٹا"

"تو یہ آدمی ایک جزیرہ تھا۔"

وہ چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے بیٹے کو آغوش میں اٹھایا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔

ذات کے ٹکڑے

میں ایک ذہنی مریض ہوں
مجھے ہسپتال سے لوٹے تین ہفتے ہو چکے ہیں اور میں اب تک اپنی ذات سے پوچھ رہا ہوں
میں کون ہوں ؟
میرا دماغ کہتا ہے میں ظالم ہوں۔ ایسا ظالم جس نے سارے خاندان کی زندگی اجیرن کر دی
باپ کو کام سے چھٹی لینی پڑی
ماں آنسو بہاتی رہی
بہن بھائیوں کو پیسے خرچ کرنے پڑے
سارے گھر کا نظام درہم برہم ہو گیا
میرا دماغ کہتا ہے ان سب باتوں کا ذمہ دار میں ہوں
میں ظالم ہوں

میں اپنے دل سے پوچھتا ہوں تو وہ کہتا ہے
میں مظلوم ہوں
اگر میں پیدائشی طور پر طاقتور ہوتا
اور میری تربیت بہتر ہوتی
حالات اتنے ناگفتنی نہ ہوتے
تو میں کبھی اپنا ذہنی توازن نہ کھوتا
ان باتوں میں میرا کیا قصور
میں مظلوم ہوں

میں اپنے گھر میں چاروں طرف دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں
جب سے ہسپتال سے آیا ہوں لوگ مجھ سے کتراتے ہیں
مُنہ موڑ کے گزر جاتے ہیں
کیا میں کوئی کرسی ہوں کوئی میز ہوں
گھر میں مہمان آتے ہیں باتیں ہوتی ہیں
نہ مجھ سے تعارف ہوتا ہے نہ گفتگو
نہ میری رائے پوچھی جاتی ہے نہ مجھ سے بحث ہوتی ہے
میں چاہے کمرے میں رہوں، یا باہر چلا جاؤں یا واپس آجاؤں
کوئی فرق نہیں پڑتا
کیا میرے گھر والے میری وجہ سے خفت اٹھاتے ہیں
میری موجودگی سے شرم محسوس کرتے ہیں
یا
مجھے گھر کے فالتو سامان کی طرح فرنیچر کے پیچھے یا قالین کے نیچے
چھپانا چاہتے ہیں
کیا میں واقعی کچھ بھی نہیں

کل رات میں نے ایک خواب دیکھا
مجھے خواب یاد نہیں رہتے
ایک مہربان چہرے سے گفتگو ہوئی
"میں کون ہوں؟" میں نے پوچھا
مہربان چہرہ مسکرایا
"ایک ادھورا خواب
ایک نامکمل تصویر"
"اور اس کا خالق؟"
"تم خود"
میں بیدار ہوگیا
میری آنکھیں مسکراہٹوں سے اٹھکیلیاں کر رہی تھیں

جنوری ۱۹۸۶ء

الجبرا یا جیومیٹری

وہ میرے پہلو میں لیٹی میری داڑھی سے کھیلتے ہوئے کہنے لگی "تم نے کل فرنچ سیکھی تھی آج میری اردو سیکھنے کی باری ہے۔"

"بصد شوق۔"

"سہیل۔ اردو میں FRIEND کو کیا کہتے ہیں؟"

"دوست۔"

"اور LOVER کو؟"

"عاشق۔"

"اور GIRL FRIEND کو؟"

"اردو میں گرل فرینڈ نہیں ہوتی۔"

"DATING کو؟"

"اس کے لیے بھی کوئی لفظ نہیں۔"

"تو پاکستان میں لوگ شادی کس سے کرتے ہیں؟"

"اپنی منگیتروں سے۔"

"اور منگیتر کیسے بنتی ہیں؟"

"دوست احباب رشتہ دار چنتے ہیں؟"

"تو کیا لوگ اپنی منگیتروں کے ساتھ سوتے ہیں؟"

"سونا کیا ملنا بھی ممکن نہیں بات تک نہیں کر سکتے۔"

"تو تمھاری شاعری میں شاعر باتیں کس سے کرتے رہتے ہیں؟"

"اپنی خیالی محبوبہ سے۔"

"تو کیا یہ محبوبہ بعد میں بیوی نہیں بنتی؟"

"تم بھی کتنی بھولی ہو اردو شاعر کی محبوبہ کبھی اس کی بیوی نہیں بنتی اور اس کی بیوی محبوبہ نہیں ہوتی"

"یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے"

"میری سمجھ سے بھی"

"ایسا کیوں ہے؟"

"ہماری سمجھ کا قصور ہے"

"سہیل کیا تم مجھے اپنی گرل فرینڈ سمجھتے ہو؟"

"ہاں"

"تو اپنی ماں کو میرے بارے میں کیا لکھتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں"

"وہ بھلا کیوں؟"

"مجھے اس کی جان عزیز ہے"

"مذاق کرتے ہو"

"نہیں پچھلی دفعہ اسے میں نے اپنی گرل فرینڈ کی تصویریں دکھائیں تو وہ ساری رات روتی رہی، پھر نماز پڑھتی رہی اور میری فلاح کی دعائیں مانگتی رہی"

"تمھاری ماں بڑی CONSERVATIVE ہے"

"ہاں کینیڈین نقطۂ نگاہ سے"

"اور پاکستانی نقطۂ نگاہ سے"

"باقی ماؤں کی طرح"

"تمھاری ماں تمھاری شادی کرانا چاہتی ہے؟"

"یقیناً"

"کس سے؟"

"کسی عورت سے"

"ہا ہا ہا"

"سہیل تم بڑے دلچسپ آدمی ہو"

"سب عورتیں یہی کہتی ہیں"

"اور تم مجھے اچھے بھی لگتے ہو"

"بہت بہت شکریہ"
"اور میں تم سے پیار بھی کرتی ہوں"
"اور بھی شکریہ"
"کیا تم مجھ سے پیار کرتے ہو؟"
"نہیں"
"وہ بھلا کیوں؟"
"کیونکہ تم مجھے اچھی لگتی ہو"
"شیطان کہیں کے۔ چلو سو جائیں"

"سہیل تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں"
"کرو"
"کیا تمھیں اندازہ ہے کہ ہم پچھلے چھ مہینوں سے DATING کر رہے ہیں"
"ہاں"
"اور وہ بھی EXCLUSIVE"
"بالکل ٹھیک"
"تو بتاؤ کہ ہمارا رشتہ کس طرف جا رہا ہے؟"
"کیا مطلب؟"
"اس کی منزل کیا ہے؟"
"وہ بذاتِ خود ایک منزل ہے"
"اس رشتے کا مقصد کیا ہے؟"
"مقصد ایک اضافی چیز ہے"
"تم پھر فلسفہ بگھارنے لگے میں سنجیدہ گفتگو کر رہی ہوں"
"میں بھی سنجیدہ ہوں"
"تو ہمارا مستقبل کیا ہوگا؟"
"میں ماہرِ نجوم نہیں ہوں"
"لیکن تم چاہتے کیا ہو؟"
"چاہنے نہ چاہنے سے کیا فرق پڑتا ہے"

"اسی سے ہی تو سارا فرق پڑتا ہے۔"

"پڑتا ہوگا۔"

"سہیل میں تمھارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔"

"میں کسی کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نہ اپنی ماں، نہ بہن نہ کسی دوست کے ساتھ رہ سکا ہوں۔"

"لیکن میں نہ تو تمھاری ماں ہوں، نہ بہن ہوں اور نہ ہی دوست۔ میں تمھاری گرل فرینڈ ہوں۔"

"میں مشکل قسم کا آدمی ہوں۔"

"دیکھو سہیل بکواس بند کرو تم بہت EVASIVE ہو اور مچھلی کی طرح SLIPPERY میں تمھیں بخوبی جان گئی ہوں تمھاری شاعری اور نفسیات اب نہیں چلے گی بات دو ٹوک ہوگی۔"

"کیسی بات؟"

"مجھے یوں لگتا ہے کہ تم اس رشتے میں COMMITTED نہیں ہو۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔"

"اور نہ کبھی تھے؟"

"یہ بھی بجا۔"

"اور نہ کبھی ہوگے؟"

"یہ بھی ممکن ہے۔"

"اور میں اپنا وقت ضائع کر رہی ہوں؟"

"یعنی چہ؟"

"میری زندگی کوئی کھلونا نہیں ہے جس کے ساتھ تم کھیلتے ہو اور نہ ہی ہم یہاں میلے کی سیر کرنے آتے ہیں۔"

"مجھے ایک عورت نے کہا تھا کہ میں کسی عورت سے محبت نہیں کر سکتا۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ مجھے اپنے خوابوں سے محبت ہے۔"

"میں اس DATING GAME کا خاتمہ کرنا چاہتی ہوں میں یا تو کسی کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں یا شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

"کس کے ساتھ؟"

"تمھارے ساتھ"

"میرے ساتھ وہ کس لیے ؟"

"کیونکہ میں تم سے محبت کرتی ہوں" —— اور تم وہی ازلی و ابدی مرد جو فطرتاً PLAY BOY ہوتا ہے۔ نہ وعدہ نہ امید نہ COMMITMENT"

"میں جھوٹے وعدے نہیں کرتا"

"اور سچے بھی نہیں کرتے۔ تم بس حال میں زندہ ہو۔ حضور EXISTENTIALIST بنے پھرتے ہیں یہ زندگی ہے کوئی نفسیات کا انٹرویو نہیں جس میں تم HERE AND NOW کا ڈھونگ رچاؤ گے"

"تم بہت غصے میں لگتی ہو"

"لگتی کیا ہوں۔ ہوں۔ تم جیسے غیر ذمہ دار مرد کے ساتھ محبت کر کے۔ تم تو غصے میں آنا ہی اپنے شایان شان نہیں سمجھتے۔ صوفی بنے پھرتے ہیں حضور صوفی ہو یا نامرد نامردوں کو غصہ نہیں آتا کبھی پیار کیا ہو تو غصہ بھی آئے نہ —— تم آخر کیا چاہتے ہو۔ میں تمھارے ساتھ رہوں یا ہمارے تعلقات ختم ہو جائیں"

"فیصلہ میں نے کرنا ہے یا تم نے"

"تم نے"

"جو سوال کرتا ہے وہی جواب بھی دیتا ہے"

"ہاں تمھیں کیا بھلا۔ میں چلی گئی تو کیا ہوا۔ حضرت نظمیں لکھنے بیٹھ جائیں گے یا اسی کو افسانہ بنا کر لکھ ڈالیں گے اور سوچیں گے کہ میں بہت MATURE ہوں اپنے تمام منفی جذبات کو غصے نفرت اور غم کو SUBLIMATE کر لیتا ہوں —— یہ سب باتیں کتابوں میں اور وہ بھی آسمانی کتابوں میں اچھی لگتی ہیں۔ جس شخص میں غصہ نفرت اور غم جیسے جذبات کے اظہار کرنے کی ہمت نہ ہو اسے خودکشی کر لینی چاہیے"

"خودکشی کی ترغیب دے رہی ہو"

"بیوقوف اور ذلیل آدمی محبت کے آداب سکھا رہی ہوں۔ جس شخص نے آج تک محبت نہ کی ہو وہ نجانے کیسے شاعر یا ماہر نفسیات بن سکتا ہے تمھارا سارا ادب اور فلسفہ اس کوکا کولا کی بوتل کی طرح ہے جو FLAT ہو چکی ہو میں تم سے جواب لینے آئی ہوں ہاں یا نہ ؟"

"جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں"

"مہاتما بدھ بننے کی بھی ضرورت نہیں"

"میں نے تمھارے ساتھ DATING ہی اس لیے شروع کی تھی کہ تم شادی وغیرہ کے جھمیلوں میں INTRESTED نہیں تھیں۔"

"نہیں تھی لیکن اب تو ہوں۔"

"تم خود اصول بدل کر مجھ سے بھی اصرار کر رہی ہو کہ میں بھی بدلوں۔"

"مجھے کیا خبر تھی کہ مجھے تم اتنے اچھے لگنے لگو گے کہ اپنی ساری زندگی داؤ پر لگانے کو تیار ہو جاؤں گی۔"

"اس کا ذمہ دار کون؟"

"تم"

"وہ کیسے؟"

"تم شعوری طور پر DISCOURAGE کرتے ہو لیکن لاشعوری طور پر ENCOURAGE کرتے ہو۔"

"میں اب کیا کہہ سکتا ہوں اصول بھی کوئی چیز ہے۔"

"کونسے اصول کیسے اصول دیکھو بھلا باتیں کون کر رہا ہے زندگی الجبرا نہیں ہے جہاں ا+ب کا مربع سیکھ کر ہر مسئلہ حل ہو سکتا ہے زندگی جیومیٹری کی طرح ہے جہاں ہر مسئلے کا تازہ حل تلاش کرنا پڑتا ہے۔ میرا خیال ہے مجھے تم سے جدا ہونا پڑے گا۔"

"مجھے اس کا افسوس ہوگا۔"

"جھوٹ بولتے ہو۔ تمھیں کسی چیز کا افسوس نہیں ہوتا۔ مجھے اب ایسے مرد کی تلاش ہے جو مجھے اپنا شریکِ زندگی بنائے گا۔ جو میری خوشیوں اور غموں میں شریک ہو سکے گا۔"

"خوشیوں غموں میں تو میں بھی شریک ہو سکتا ہوں لیکن گھر بنانے اور بچے پیدا کرنے میں شریک نہیں ہو سکتا۔"

"آج کے بعد تم سے سب امیدیں منقطع۔ پھر کبھی ملیں گے۔"

"ضرور"

"سہیل اتنی شام گئے کہاں؟"

"تم سے ملنے آیا ہوں اور ایک تحفہ لایا ہوں۔"

"یہ کیا ایک پینٹنگ ——— کتنی خوبصورت ہے FRIENDS نام کی۔"

"میرا خیال تھا تم کوئی نیم عریاں تصویر لے کر آؤ گے۔"

"ہر چیز کا موقع ہوتا ہے۔"
(کافی دیر بعد)
"سہیل ہم BOYFRIEND اور GIRL FRIEND تو نہیں رہے۔"
"نہیں"
"تو پھر ہمارا تعلق کیا ہے؟"
"جو اس پینٹنگ کا نام ہے FRIENDS"
"اس کا مطلب کیا ہوگا۔"
"ہم ایک دوسرے سے ملا کریں گے اور خوشی اور غم میں شریک رہیں گے۔"
"کتنے عرصے کے بعد ملا کریں گے؟"
"جب جی چاہا اور جب فارغ ہوئے۔"
"تو کیا اب ہم اکٹھے نہیں سویا کریں گے؟"
"نہیں"
"کیوں نہیں؟"
"FRIENDS تو اکٹھے نہیں سوتے۔"
"کیوں نہیں سوتے؟"
"بس نہیں سوتے۔"
"کیا تمھاری اب کوئی GIRL FRIEND ہے؟"
"نہیں۔"
"اور نہ میرا کوئی BOY FRIEND ہے جب تک تمھیں کوئی GIRL FRIEND نہیں مل جاتی اور میرا BOY FRIEND نہیں بن جاتا اکٹھے سونے میں کیا حرج ہے؟"
"حرج؟"
"آج رات یہیں ٹھہر جاؤ۔"
(میں سوچ میں پڑ گیا)

فروری ۱۹۸۵ء

دوباپ

کردار

اکمل —— ہندوستانی انجینیر جو کینیڈا میں مقیم ہے

سلیم —— اس کا جوان بیٹا

مارلین —— سلیم کی کینیڈین گرل فرینڈ

ڈون —— مارلین کا باپ (اکمل کا دوست) کینیڈین انجینیر

مارلین :- (سلیم کو ہلاتے ہوئے) جاگو سورج نکل آیا ہے۔

سلیم :- (آنکھیں ملتے ہوئے) تمھاری صبح ہو چکی ہو گی میرے لیے ابھی رات ہی ہے۔

مارلین :- (خوشی سے) یہ پہلی دفعہ ہے کہ میں تمھارے پہلو میں جاگی ہوں۔

سلیم :- (قدرے ملول ہو کر) اور شاید آخری دفعہ

مارلین :- وہ بھلا کیوں ؟

سلیم :- میرے باپ کو گر پتہ چل گیا کہ تم رات یہاں رہی ہو تو ہم دونوں کو قتل کر دے گا۔

مارلین :- (ہنستے ہوئے) تم تو ہر بات میں مذاق شروع کر دیتے ہو۔

سلیم :- زندگی کے اکثر سانحے مذاق ہی سے تو شروع ہوتے ہیں۔

مارلین :- تو پھر کیا کیا جائے۔

سلیم :- (بے تکلفی سے) خاموشی سے اٹھو۔ ہاتھ مُنہ دھوا ور گھر چلی جاؤ۔

مارلین :- اور ناشتہ۔

سلیم :- ناممکن۔

مارلین :- یہ تو کوئی معقول بات نہیں۔

سلیم :- میرے گھر کے بیسمنٹ میں ایسا ہی ہو گا۔

مارلین :- تو پھر اگلے ویکنڈ میرے گھر چلے آنا۔

سلیم :- سوچوں گا۔

سلیم مارلین کو رخصت کرکے گھر میں داخل ھوا

اکمل :- سلیم۔
سلیم :- جی۔
اکمل :- تم اتنی صبح سویرے باہر لان میں کیا کر رہے تھے۔
سلیم :- (جھینپتے ہوئے) اپنے دوست سے باتیں کر رہا تھا۔
اکمل :- کس دوست سے۔
سلیم :- (قدرے توقف کے بعد) مارلین سے۔
اکمل :- تمھاری گرل فرینڈ۔
سلیم :- (آہستہ سے) جی ہاں۔
اکمل :- کیا وہ رات یہاں ٹھہری تھی۔
سلیم :- (خاموشی)
اکمل :- (تحکمانہ انداز میں) میں کیا پوچھ رہا ہوں؟
سلیم :- (قدرے سہمے ہوئے) جی ہاں
اکمل :- (آہستہ آہستہ سلیم کی طرف بڑھتا ہے۔ سلیم نظریں جھکائے کرسی کا سہارا لیے کھڑا ہے اس کی گرفت کرسی پر سخت ہوتی جاتی ہے) اگر تم نے آئندہ اس قسم کی حرکت کی تو.... (سلیم کے پاؤں میں رعشہ تھا اور کمال ضبط سے الفاظ گلے میں دب رہے تھے)
سلیم :- تو؟
اکمل :- یا تم اس گھر میں رہو گے یا میں۔
(سلیم نے اس زور سے کرسی کو دبایا کہ اس کے چرچرانے کی آواز آئی۔ وہ کچھ کہے بغیر نگاہیں جھکائے اور تھوک نگلتے ہوئے کمرے سے نکل گیا)

شام کو ٹینس کلب میں چائے پیتے ھوئے

ڈون :- کیا حال ہیں اکمل۔
اکمل :- ٹھیک ہوں۔ تمھارا کیا حال ہے؟
ڈون :- خوش ہوں۔ سنا ہے میری بیٹی تمھارے بیٹے سے عشق لڑا رہی ہے۔

اکمل :- (ناراضگی سے) ہاں۔

ڈون :- مجھے پتہ چلا ہے کہ کل رات تمھارے یہاں تھی۔

اکمل :- (شرماتے ہوئے) میں نے سلیم کی بہت مرمت کی۔

ڈون :- وہ کیوں ؟

اکمل :- اس کا کردار بگڑتا جا رہا ہے۔

ڈون :- میں سمجھا نہیں۔

اکمل :- میں اپنے گھر میں اس قسم کی حرکات برداشت نہیں کر سکتا۔

ڈون :- وہ اس کا بھی تو گھر ہے۔

اکمل :- لیکن میں گھر کا مالک ہوں وہ گھر سے باہر جو جی چاہے کرے لیکن اسے گھر کے اندر میرے اصولوں کی خلاف ورزی کرنے کی اجازت نہیں۔

ڈون :- (حیرانگی سے) تمھارے کیا اصول ہیں۔

اکمل :- وہ میرے گھر میں سگریٹ نہیں پی سکتا، گالی نہیں دے سکتا اور اپنی گرل فرینڈ کو رات میں نہیں رکھ سکتا۔

ڈون :- گویا گھر کے باہر سب کچھ کر سکتا ہے۔

اکمل :- وہ اس کا ذاتی عمل ہے۔

ڈون :- اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ تمھیں اس کے کردار سے زیادہ اپنے گھر کی فضا کی فکر ہے۔

اکمل :- تم بھی تو باپ ہو تمھارا کیا رویہ ہے۔

ڈون :- میں تو اس بارے میں زیادہ فکر مند رہتا ہوں کہ میرے بچے کیا کرتے ہیں اور کیا نہیں کرتے بجائے اس کے کہ کہاں کرتے ہیں اگر وہ شراب پیتے ہیں تو گھر میں پینے میں کیا مضائقہ ہے اس کے علاوہ جن چیزوں کو تم برا سمجھتے ہو شاید میں نہیں سمجھتا۔

اکمل :- کیا تم اپنے بچوں کے ساتھ شراب پیتے ہو ؟

ڈون :- ہاں۔ جب بھی جی چاہے۔

اکمل :- کیا تمھاری بیٹی کو اپنا بوائے فرینڈ گھر لانے کی اجازت ہے۔

ڈون :- میرا گھر اور اس کا گھر ایک ہی ہے۔

اکمل :- کیا وہ رات بھی رہ سکتا ہے۔

ڈون :- یہ تو میری بیٹی پر منحصر ہے کہ وہ اسے رات رکھنا چاہتی ہے یا نہیں میرے لیے مسئلہ رات رہنے کا نہیں فکر اس بات کی ہے کہ وہ کس قسم کے آدمی کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی

ہے۔ اگر مجھے اس کا بوائے فرینڈ پسند نہ آئے تو میں اسے بتا دیتا ہوں ـــــ لیکن یہاں بات سلیم کی ہے وہ تو بہت پیارا انسان ہے میں اسے پسند کرتا ہوں۔

اکمل :۔ گویا سلیم تمھارے گھر رات رہے تو تمھیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

ڈون :۔ (ہنس کر) نہیں۔ بالکل نہیں۔ وہ تو بالکل میرے بیٹوں کی طرح ہے۔ مارلین اور سلیم دونوں سمجھدار بچے ہیں۔

اکمل :۔ میں تمھارا نقطۂ نظر سمجھنے سے قاصر ہوں۔

ڈون :۔ اور مجھے تمھارا فلسفۂ زندگی سمجھنے میں دقت ہو رہی ہے۔ کبھی بیٹھ کر تفصیلی گفتگو کریں گے۔

اکمل :۔ گڈ بائے۔

ڈون :۔ گڈ بائے۔

مارچ ۱۹۸۵ء

نوح کے رشتہ دار

حقیقت سے آنکھیں چرانا کہاں کی دانائی ہے۔
ماضی سے رشتے منقطع کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔
بغاوت کے گھوڑے پر سوار ہو کر فخر کرتے ہو ـــــ تمھیں شرم آنی چاہیے۔
ایسا لگا کسی نے میرے سینے میں خنجر گھونپ دیا ہو۔
نجانے کتنے ناسوروں کے مُنہ کھل گئے۔
میری آنکھوں میں خون اتر آیا اور زبان سے تلخیوں کے چشمے ابل پڑے۔
ہمیں اپنے والدین سے محبت کرنی چاہیے ان کے اصولوں کی پیروی کرنی چاہیے۔
اور اگر نہ کریں تو احساسِ گناہ کے بوجھ تلے دبنا چاہیے۔
اور اگر احساسِ گناہ بھی نہ ہو تو اپنی بے حسی کا ماتم کرنا چاہیے۔
ماضی کے پرستار اور روایات کے محافظ اسے اپنا حق سمجھتے ہیں کہ وہ آنے والی نسلوں پر بغاوت کے الزام لگا کر انھیں گمراہ ثابت کرنے کی کوشش کریں۔
میں نے کسی غیر مذہبی شخص کو لوگوں کے دروازوں پر دستک دیتے نہیں دیکھا اور التجا کرتے نہیں سنا کہ تم مسجد یا گرجا یا مندر مت جاؤ۔ لیکن مذہب کے پیروکار اسے اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ وہ ہر کس و ناکس کے دروازے پر دستک دیکر ہدایت کی تلقین کریں اور اگر لوگ ان کے مُنہ پر دروازہ بند کر دیں تو مایوس ہو جائیں۔
انسانی جذبات بھی عجیب ہیں ـــــ بے لگام گھوڑوں کی طرح ـــــ منطق کے دام میں نہیں آتے۔
بعض دفعہ محبت یا عزت کرنا تو کیا اپنوں کو برداشت کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔
میں برسوں کی تلخیوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے رات تین بجے گھر داخل ہوا۔ یہ دیکھ کر حیرانگی ہوئی کہ ایک کمرے میں چراغ جل رہا تھا۔ مجھے گریہ وزاری کی آوازیں آئیں ـــــ دبے پاؤں

قریب گیا تو ابو کو سجدے میں گڑگڑاتے ہوئے پایا ـــــ میری موجودگی سے بالکل بے خبر۔

"میرے پروردگار۔ تیرا جتنا شکریہ ادا کروں اتنا کم ہے تو نے مجھے اولادِ نرینہ سے نوازا۔ مجھے ایک خوبصورت اور ذہین بیٹا دیا وہ اخلاقِ حسنہ کا نمونہ ہے لوگ اس کے کردار کے گن گاتے ہیں لیکن اس کی زندگی میں ایک کمی رہ گئی ہے وہ تجھ سے دور ہو گیا ہے"۔

ابو کی آواز ہچکیوں میں دب گئی۔ میرے پاؤں شل محسوس ہونے لگے میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ ابو کی آواز پھر واضح ہوئی۔

"میرے مولا۔ مجھے معاف کر دے میں تیرا گنہگار بندہ ہوں شاید میری تربیت میں کچھ کمی رہ گئی شاید میں نے کچھ ایسے گناہ کیے تھے جن کی مجھے سزا مل رہی ہے۔ الٰہی! مجھے بخش دے درگزر فرما۔ وہ بہت مخلص بچہ ہے اس کی کوتاہیوں سے درگزر فرما اسے راہِ راست پہ آنے کی توفیق عطا فرما۔ اگر اسے روشنی نہ ملی تو مجھے فکر ہے آنے والی نسلیں اس روشنی سے محروم رہ جائیں گی۔ الٰہی! ہم دونوں کو بخش دے"۔

میرے قدموں پہ لرزہ طاری تھا۔

میرے جذبات میں تموج تھا۔ برسوں کی تلخیاں آنسو بن کر میرے گالوں پر پھیل رہی تھیں بند ٹوٹ رہے تھے۔

میں نے ایک قدم آگے بڑھایا تاکہ ابو کو گلے لگالوں لیکن پھر رک گیا اور دبے پاؤں اپنے کمرے میں چلا گیا ـــــ صبح تک تکیہ بھیگتا رہا اور میں کروٹیں بدلتا رہا۔

جولائی ۱۹۸۵ء

رنگین لیبل ـــ کھوکھلے ڈبے

وہ اپنی کار میں بیٹھی کانپ رہی تھی۔

اس کی خود اعتمادی کی عمارت متزلزل تھی ـــــ ذات کے نہاں خانوں میں شگاف پڑ رہے تھے۔

جیولی ایک ایسے دن کی دہلیز پر بیٹھی تھی جو بظاہر معمولی نظر آتا ہے لیکن اس کے اندر ہیجان انگیز جذبات اور کرب انگیز کیفیات کا ایک نگار خانہ آباد ہوتا ہے۔

"کیا میں واقعی خوش قسمت اور کامیاب عورت ہوں؟" زندگی میں پہلی دفعہ اس کے ذہن میں یہ سوال ناگ بن کر ابھرا تھا اور اس کے ساتھ ہی بہت سی یادیں بانسری بجاتی ہوئی چاروں طرف سے جمع ہو گئی تھیں۔

"تم بہت خوبصورت ہو"

"تم بہت خوش قسمت ہو"

"اس چھوٹی عمر میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر بن گئی ہو"

"تم سوپر وومن ہو ـــــ گھر اور دفتر دونوں میں کامیاب"

"سب عورتیں تم پر رشک کرتی ہیں"

اور وہ لوگوں کی باتوں پر برسوں سے یقین کر بیٹھی تھی"

وہ ایک کامیاب عورت تھی ـــــ شہر کے متمول علاقے میں مکان بھی خرید لیا تھا ایک قیمتی کار بھی رکھ لی تھی اور ڈائرکٹر کے ریٹائر ہونے کے بعد اس کی کرسی سنبھالنے کی امید بھی تھی۔ اسے کتنی خوشی تھی کہ وہ اپنی کمپنی کی پہلی عورت ڈائرکٹر ہو گی ـــــ ان تمام مسرتوں کے باوجود اس دن ایک غیر متوقع واقعہ پیش آیا جس نے اس معمولی دن کو غیر معمولی بنا دیا۔

اس نے مہینوں کی بحث کے بعد اپنے بوس کو راضی کر لیا تھا کہ وہ صوبائی میٹنگ میں ڈائرکٹر کا نمائندہ بن کر جائے گی اس نے سب تیاری کر لی تھی۔ لائبریری جا کر ریسرچ کا کام بھی کر لیا

تھا، اپنی کمپنی کی تفاصیل بھی از بر کر لی تھیں، اپنی تقریر بھی تیار کر لی تھی ——— یہاں تک کہ ان کپڑوں کا انتخاب بھی کر لیا تھا جو پہن کر میٹنگ میں جانا تھا۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ لیکن ......

اس صبح اول تو الارم نہ بجا۔ وہ آدھ گھنٹہ دیر سے اٹھی۔ پھر اپنے بیٹے جانتھن کو تیار کرنا چاہا تو وہ رونے لگا۔

" جلدی تیار ہو جاؤ۔ کیا تم نے بے بی سٹر کے پاس نہیں جانا؟"

" نہیں" جانتھن نے جواب دیا۔

" جلدی کرو" وہ چیخی۔

جانتھن پھر سو گیا ——— جیولی لوٹ کر آئی تو غصے میں جانتھن کو گھسیٹتا اور غسلخانے میں لے جا کر پٹخا۔ جانتھن رونے لگا۔

" دیر ہو رہی ہے تمھیں ذرا بھی احساس نہیں" وہ اور زور سے چیخی۔

جانتھن کو نیم خوابی کے عالم میں تیار کیا اور اسے دودھ کا گلاس تھمایا۔ جیولی نے کپڑے پہن کر جلدی سے جانتھن کو اٹھایا تو سارا دودھ اس کے کپڑوں پر گر گیا ——— جیولی آپے سے باہر ہو گئی اور جانتھن کو دو چانٹے لگائے۔

روتا ہوا جانتھن چپ ہو گیا ——— وہ سہم گیا۔

جیولی بھی سہم گئی۔ اس نے پہلے کبھی یہ حرکت نہ کی تھی۔

وہ دفتر پہنچی تو اسے یاد آیا کہ وہ اپنی تقریر گھر بھول آئی ہے۔

وہ میٹنگ میں اپنے حافظے سے باتیں کرتی رہی۔

اس کی اعتماد کی عمارت متزلزل ہونے لگی۔ وہ اپنی کارکردگی سے بالکل مطمئن نہ تھی۔

وہ اپنی کارکردگی سے کبھی بھی مطمئن نہ تھی۔

گھر پہنچی تو بیبی سٹر نے پیغام دیا کہ جانتھن ہسپتال میں ہے اسے سخت بخار تھا۔

جیولی کی ذات کی ایک اینٹ پھسلی۔

پھر دوسری پھر تیسری

ایک شگاف پڑ گیا۔

ہسپتال میں جانتھن اس کا منتظر تھا لیکن اس نے اپنے سوشل کلب کی ماہانہ میٹنگ کی صدارت کرنی تھی۔ وہ دل کڑا کر کے کلب آگئی ——— لیکن کار سے باہر نہ نکل سکی۔

وہ کار میں بیٹھی کانپ رہی تھی۔

شکوک وشبہات اس کی پوری ذات کو جھنجھوڑ رہے تھے۔

کیا میں واقعی ایک کامیاب عورت ہوں ؟
اگر میں خوبصورت ہوں تو اس میں میرا کیا کارنامہ ہے ؟
میں نے شادی کی کیونکہ سب عورتیں کرتی ہیں ۔
میں نے بچہ پیدا کیا کیونکہ خاندان والوں کا اصرار تھا ۔
میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر بنی کیونکہ کچھ لوگ مستعفی ہو گئے ۔
میرا ہر کام مصنوعی ہے ـــــ اعتماد سے خالی ۔
نہ گھر میں کامیاب ہوں نہ دفتر میں ۔
ذات کی ایک اور اینٹ گری ـــــ ایک اور
اس نے اپنے اندر جھانکا ـــــ ایک کھوکھلی عمارت تھی ۔
کیا میں اپنی ذات کی تلاش میں اپنی ذات کو کھو رہی ہوں ؟
وہ کلب کے پارکنگ لوٹ میں کافی دیر تک اپنی کار میں بیٹھی رہی ۔
شہر کے بہت سے معززین اس کی ذات سے بے خبر کلب کی طرف قدم بڑھا رہے تھے ۔
ڈاکٹر ، انجینیر ، وکیل ، بزنس مین ـــــ مرد اور عورتیں ـــــ چہروں پر خوبصورت مسکراہٹیں اور جسموں پر رنگین لباس سجائے ہوئے ـــــ اسے یوں لگا وہ ان کے چہروں اور عہدوں کو پہچانتی ہے لیکن ان کی شخصیات کو نہیں جانتی ۔

"کیا ہم سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں ؟" ایک سوال نے بے چینی سے کروٹ بدلی اس نے کار اسٹارٹ کی اور کلب سے ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئی ۔

اگست ۱۹۸۵ء

بڈی

رابرٹ نے کالی بڑھیا کو ایک کالے کتے کو بڑے پیار سے کنگھی کرتے دیکھا تو وہ چند لمحوں کو رک گیا اسے وہ منظر بہت حسین لگا اس بڑھیا نے کتے کو اپنی گود میں لیا ہوا تھا اور اس کے ساتھ اٹھکھیلیاں کر رہی تھی کبھی وہ کتے کو گھاس پر چھوڑ دیتی اور وہ بھاگنے لگتا اور کبھی اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیتی ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ عورت اپنی مادرانہ شفقت اس کتے پر نچھاور کر رہی ہو۔ رابرٹ کچھ دیر تک دونوں کو دیکھتا رہا پھر دل ہی دل میں مسکرایا اور اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

رابرٹ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں زندگی میں چھوٹی چھوٹی باتیں محظوظ کرنے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔

رابرٹ پینتیس برس کا شادی شدہ جوان تھا جو اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ ٹورانٹو میں رہائش پذیر تھا وہ پچھلے چند برسوں سے یونیورسٹی میں جیالوجی GEOLOGY پڑھاتا تھا اور مختلف انواع واقسام کی چٹانوں کے بارے میں تحقیق کر رہا تھا کچھ عرصہ پیشتر اسے معلوم ہوا تھا کہ سینٹ انڈریوز SAINT ANDREWS میں ایسی چٹانیں موجود ہیں جو اس کی تحقیق میں کام آسکتی ہیں اس لیے وہ چند ہفتوں کے لیے اس ساحلی شہر چلا آیا تھا جو امرا کا مسکن تھا وہ ایک خوبصورت شہر تھا جہاں کینڈا اور امریکہ کے رؤسا نے اپنے اپنے گھر بنائے ہوئے تھے اور گرمیوں کی چھٹیاں وہاں آکر گزارتے تھے۔

رابرٹ کے ایک دوست کا سینٹ انڈریوز میں گھر تھا چونکہ وہ چند مہینوں کے لیے یورپ کی سیر کے لیے گیا ہوا تھا اس لیے وہ گھر خالی تھا رابرٹ نے اسی گھر میں گرمیوں کے چند ہفتے گزارنے کا تہیہ کیا تھا رابرٹ کو پہلے دن ہی وہ جگہ بہت پسند آئی تھی ایک طرف پانی ایک طرف سبزہ درمیان میں چھوٹا شہر۔ فضا میں پھولوں کی خوشبو اور پرندوں کی چہچہاہٹ بہت خوش آئند تھی۔ وہ سارا دن سیر کرتا رہا تھا اور اس شہر سے آشنائی حاصل کر چکا تھا۔

دوسرے دن رابرٹ اپنی مخصوص چٹانوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا چند گھنٹوں کی

تلاش کے بعد اسے مطلوبہ چٹانوں کے آثار مل گئے تھے وہ بہت خوش ہوا تھا اسے پہلے دن ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا یہ گرمیوں کا دورہ کامیاب رہے گا جب اس کی گھڑی نے پانچ بجائے وہ گھر کی طرف روانہ ہوا وہ پانچ بجے کے بعد کام کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ جب وہ خراماں خراماں چہل قدمی کر رہا تھا تو سڑک کے کنارے ایک چھوٹے سے باغ میں اسے وہ کالی عورت کالے کتے کو بڑے پریم سے کنگھی اور اٹھکھیلیاں کرتی نظر آئی تھی اور وہ اس منظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے رک گیا تھا اس کا جی تو چاہتا تھا کہ جا کر اس بڑھیا سے گفتگو کرے لیکن پھر وہ نجانے کیا سوچ کر گھر کی طرف بڑھ گیا۔

رابرٹ روزانہ پانچ بجے گھر کی طرف روانہ ہوتا اور ہر روز اسے بڑھیا اور کتا نظر آتے شاید وہی وقت بڑھیا کی سیر کا وقت تھا رابرٹ کو ایسے لگ رہا تھا جیسے تعارف اور ملاقات کیے بغیر بھی وہ ان سے آشنا تھا۔

آخر چند دنوں کے بعد ان کی ملاقات ہو ہی گئی رابرٹ ایک دوکان سے آئس کریم خریدنے آیا تو اس نے بڑھیا کو کتے کو آئس کریم کھلاتے دیکھا رابرٹ نے کتوں کو آئس کریم کھاتے نہیں دیکھا تھا اس نے مسکرا کر کہا۔

"آپ کا کتا بہت دلچسپ دکھائی دیتا ہے۔"

بڑھیا بولی "بہت پیارا بھی ہے اس کا نام BUDDY (بڈی) ہے یعنی میرا دوست۔"

"کتنی عمر ہے اس کی؟"

"تقریباً پانچ برس۔"

"آئس کریم بہت مزے سے کھا رہا ہے۔"

"ہاں یہ آئس کریم اور چاکلیٹ کا بہت شیدائی ہے۔"

رخصت ہوتے وقت رابرٹ نے اپنا نام بتایا اور بڑھیا نے بتایا کہ اس کا نام سارا ہے دونوں خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوئے۔

رابرٹ کو سارا اور بڈی بہت بھلے لگے تھے آخر اس چھوٹے سے شہر میں اس نے دو آشنا بنا ہی لیے تھے۔

اگلے دن جب رابرٹ اپنے کام سے لوٹ رہا تھا تو سارا اور بڈی کو دیکھ کر رک گیا اور باغ میں ان کے قریب جا کر بیٹھ گیا سارا نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا رابرٹ نے بڈی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور سارا سے باتیں کرنے لگا پہلے تو سارا اس سے اس کے کام کے متعلق باتیں کرتی رہی اور وہ اسے تفاصیل بتاتا رہا اس کے بعد گفتگو کا موضوع بڈی بن گیا رابرٹ نے محسوس کیا کہ جونہی

سارا نے بڈی کے بارے میں گفتگو کرنی شروع کی اس کی آنکھوں میں چمک اور آواز میں جذباتیت پیدا ہوگئی ـــــ اس نے بڈی کی تعریفوں کے پل باندھ دیے وہ کتنا خوبصورت ہے، کتنا نفاست پسند ہے، کتنا ہوشیار ہے، کتنا عقلمند ہے، کتنا وفادار ہے۔ رابرٹ کو چند لمحوں کو لگا جیسے ایک عورت کتے کی نہیں اپنے محبوب کی تعریفیں کر رہی ہو۔ رابرٹ کی دلچسپی بڑھ گئی۔

جب سورج ڈوبنے لگا تو رابرٹ نے سارا کو اپنے گھر کوئی کے لیے بلایا سارا کہنے لگی میں ضرور چلتی لیکن بڈی کے دودھ پینے کا وقت ہوگیا ہے اس لیے اس نے گھر جانا ہے اس نے رابرٹ کو اپنے ساتھ جانے کی دعوت دی جو رابرٹ نے قبول کر لی۔

رابرٹ سارا کے گھر سے بہت متاثر ہوا وہ لکڑی کا بنا ہوا ایک پرانا گھر تھا جس کی اپنی جداگانہ شخصیت تھی خوبصورت اونچے اونچے دروازے منقش چھتیں اور بل کھاتا ہوا زینہ، رابرٹ نے بہت کم گھر ایسے دیکھے تھے وہ تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا اس گھر کی خوبصورتی پر سارا کی سلیقہ شعاری مستزاد تھی ہر چیز پر نفاست کی مہر ثبت تھی۔ سارا بڈی کو دودھ پلا چکی تو رابرٹ کو گھر دکھانے لگی آخر میں اس نے رابرٹ کو بڈی کا کمرہ دکھایا جسے دیکھ کر رابرٹ حیران رہ گیا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی نواب زادے کا کمرہ ہو سارا نے اس کمرے پر سینکڑوں ڈالر خرچ کیے تھے خوبصورت تصویروں اور پوسٹروں کے علاوہ انواع و اقسام کے کھلونے اور ہڈیوں کے ماڈل بڈی کے لیے اس کمرے میں موجود تھے ایک طرف اس کا مخملیں بستر تھا جس میں سارا نے اسے دودھ پلا کر سلا دیا تھا۔ رابرٹ نے آج تک کسی کتے کی اتنی پذیرائی ہوتے نہیں دیکھی تھی چنانچہ اس نے کہا

"سارا بڈی آپ کو بہت پیارا لگتا ہے۔"

"یہ میری جان ہے اس کے بغیر میری زندگی ناممکن ہے۔"

رابرٹ کے ذہن میں کئی سوال ابھرے لیکن زبان تک نہ آسکے اس نے خاموش رہنے میں ہی مصلحت سمجھی۔

اس ابتدائی ملاقات کے بعد رابرٹ کا سارا کے گھر آنا جانا بڑھ گیا۔ وہ کافی دیر تک گفتگو کرتے رہتے باتوں ہی باتوں میں سارا نے رابرٹ کو بہت سی باتیں بتا بھی دی تھیں اور نہیں بھی بتائی تھیں رابرٹ کو پتہ چل گیا تھا کہ سارا کی ماں امریکن تھی لیکن باپ افریقہ کا حبشی تھا وہ بوسٹن کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئی تھی اس کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد اس کا باپ افریقہ گیا اور پھر لوٹ کر نہیں آیا سارا پورے گاؤں میں واحد کالی لڑکی تھی اس کی والدہ کافی امیر تھی اس کا ایک گھر بوسٹن کے علاقے میں تھا اور دوسرا سینٹ انڈریوز میں سارا ابھی جوان ہی تھی کہ اس کی والدہ بہت بیمار ہوگئی اور نرسنگ ہوم میں داخل ہوگئی وہاں اس نے جانکنی کے چند

سال گزارنے کے بعد اس دنیا کو الوداع کہہ دیا۔ سارا مختلف شہروں میں رہنے کے بعد پچھلے چار سال سے اپنے کتے بڈی کے ساتھ اپنی ماں کے گھر سینٹ انڈریوز میں آ بسی تھی۔

رابرٹ سارا سے کئی ملاقاتیں کر چکا تھا لیکن بے تکلفی کی سرحدیں عبور نہ کر پایا تھا اسے یہی لگتا تھا کہ ان کے درمیان تکلفات کی دیواریں حائل ہیں اسے ہر لمحہ فاصلوں کا احساس رہتا تھا۔ سارا اگرچہ خوش خلق تھی اور مسکرا کر ملتی تھی لیکن اس کی مسکراہٹیں خوشیوں کی بجائے کرب کی غمازی کرتی تھیں۔ وہ اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بڑی خوبصورتی سے چھپا جاتی تھی۔ رابرٹ اس کے چہرے سے ماضی کی پرچھائیاں پڑھنے کی کوشش کرتا لیکن قیاس آرائیوں سے آگے نہ بڑھ پاتا حقیقتیں ہمیشہ اس کی دسترس سے باہر رہتیں، سارا کے بڈی سے تعلقات بھی اس کی سمجھ سے بالاتر تھے وہ اس کی زندگی کا مرکز و محور تھا اس کا اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، سونا، جاگنا —— گویا سارے دن کا معمول اس کے گرد گردش کرتا تھا حتیٰ کہ وہ رات کو بھی اسے اپنے پہلو میں لے کر سوتی تھی۔ رابرٹ کبھی کبھار سوچتا کہ اسے نفسیات کا طالب علم ہونا چاہیے تھا تاکہ وہ حالات کو بہتر سمجھ سکتا اور گتھیوں کو سلجھا سکتا۔

اگلے چند دن حسبِ معمول گزر گئے۔

ایک دن رابرٹ کام سے لوٹا تو سارا اور بڈی کو باغ میں نہ پاکر کچھ حیران ہوا یہ پہلا دن تھا جب ان کی مڈبھیڑ نہ ہوئی تھی رابرٹ نے سوچا سارا کسی اور کام میں مصروف ہوگی اس کے بعد جب دوسرے اور تیسرے دن بھی سارا سے ملاقات نہ ہوئی تو رابرٹ فکرمند ہوا اور سارا سے ملنے گیا۔ رابرٹ نے گھنٹی بجائی تو کوئی جواب نہ آیا چند دفعہ گھنٹی بجانے کے بعد اندر سے آواز آئی

"کون ہے؟"

"رابرٹ"

"اندر آجاؤ" اندر سے آواز آئی۔

رابرٹ اندر داخل ہوا تو حیران و ششدر رہ گیا سارا کے بال بکھرے ہوئے، چہرے پر اداسیاں اور آنکھوں میں آنسو۔ رابرٹ کچھ سمجھ نہ پایا۔

"کیا بات ہے سارا؟"

"بڈی کی طبیعت ٹھیک نہیں اس کی ٹانگ زخمی ہوگئی ہے۔"

رابرٹ کو پھر پتہ چلا کہ بڈی ایک حادثے کا شکار ہو گیا ہے اس کی ٹکر ایک بائیسکل سے ہوگئی جس میں اس نے اپنی ٹانگ توڑلی۔ وہ اب چلنے پھرنے سے معذور تھا لیکن اس کا جو اثر سارا پر ہوا تھا وہ حیرت انگیز تھا ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ بڈی کی نگہداشت میں اتنی مصروف ہوئی تھی

کہ اپنی زندگی مفلوج کر بیٹھی تھی۔

رابرٹ نے بڑے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا "سارا تم بہت پریشان ہو کیا میں کچھ مدد کر سکتا ہوں؟"

پہلے تو سارا خاموش رہی پھر اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو اس کے چند دنوں کے پہنے ہوئے میلے کپڑوں پر گرنے لگے آہستہ آہستہ وہ زور زور سے رونے لگی پھر سسکیاں بھرنے لگی وہ متواتر روتی رہی یہاں تک کہ اس کی ہچکی بندھ گئی۔ رابرٹ کو سمجھ نہ آیا کہ کیا کرے اس نے تو ہمیشہ سارا کو مسکرانے کی کوشش کرتے دیکھا تھا ایسے لگتا تھا ضبط اور صبر کے سب بندھ ٹوٹ گئے ہوں رابرٹ نے پانی کا گلاس لا کر پلایا تو اس کی ہچکی بند ہوئی سارا روتے روتے کہنے لگی۔

"رابرٹ تم نہیں جانتے کہ میں کتنی دکھی اور تنہا عورت ہوں میری زندگی سراپا المیہ ہے میری ماں نے ایک حبشی سے شادی کر کے مجھے پیدا ہونے سے پہلے ہی قبر میں اتار دیا تھا میں زندگی کی سوتیلی بیٹی ہوں میری سیاہ جلد میری ناکردہ گناہوں کی سیاہی کی طرح ہے میرا زندگی میں ایک ہی رفیق تھا اسی لیے میں اسے بڑی کہتی ہوں ورنہ میں نے بچپن سے ہی اجنبیوں سے ملاقاتیں کی ہیں میں جس علاقے میں پلی بڑھی وہاں میں واحد سیاہ بچی تھی اور سب بچے مجھے "کالی" "گندی" اور "موٹی" کہہ کر تنگ کیا کرتے تھے میرے ساتھ کوئی بھی نہیں کھیلتا تھا اور میں روتے روتے گھر آجایا کرتی تھی میری ماں مجھ پر ترس کھاتی تھی لیکن کچھ کر نہ سکتی تھی۔"

سارا کافی دیر تک روتی رہی اور باتیں کرتی رہی یہاں تک کہ اس کی دل کی بھڑاس نکل گئی اور اس کی طبیعت سنبھل گئی۔

رابرٹ ایک طرف تو سارا کو غمگین دیکھ کر پریشان تھا لیکن دوسری طرف خوش تھا کہ سارا نے کھل کر باتیں کرنی شروع کر دی تھیں اور ان کے درمیانی پردے اٹھتے دکھائی دے رہے تھے۔

جب سارا کی طبیعت سنبھل گئی تو رابرٹ نے شراب پینے کی خواہش کا اظہار کیا سارا دو گلاس بھر کے لے آئی اور دونوں باتیں کرنے لگے رابرٹ نے سارا کو اپنی زندگی کی کچھ تلخیاں بتائیں اور کچھ واقعات سے پردہ ہٹایا اس نے بتایا کہ جب اس کا بیٹا بریڈلی تین برس کا تھا تو وہ ایک دن بستر سے گر پڑا اور اپنا بازو توڑ بیٹھا ایکسرے سے معلوم ہوا کہ اس کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی ڈاکٹر نے اس کے بازو پر چند ہفتوں کے لیے پلستر لگا دیا ننھے سے معصوم بچے کو پلستر میں دیکھ کر سب کا دل بھر آتا رابرٹ بعض دفعہ اتنا بے چین ہوتا کہ بریڈلی کو اس کی دادی کے پاس چھوڑ آتا۔ رابرٹ نے خود ہی محسوس کیا کہ وہ اپنے بیٹے بریڈلی کا ذکر کرتے ہوئے ایسے ہی جذباتی

ہوگیا تھا جیسے سارا بڈی کا ذکر کرتے ہوئے ہو جاتی تھی۔

وہ شام اگرچہ غمگین تھی لیکن رابرٹ اور سارا کو جذباتی طور پر قریب لانے کے لیے کافی ثابت ہوئی رابرٹ سوچنے لگا کہ سارا کو دیکھ کر اسے نجانے کیوں اپنی ماں کی یاد آجاتی دونوں کی عمر ساٹھ پینسٹھ کے قریب تھی اور دونوں بھاری بھر کم تھیں۔

بڈی کی ٹانگ کا زخم بہتر ہونے لگا اور اس کے ساتھ ساتھ سارا کی طبیعت بھی سنبھلنے لگی جس دن بڈی چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا اس دن سارا بہت خوش تھی اس نے خاص مٹھائی بنائی اور رابرٹ کو دعوت دی۔ رابرٹ بخوشی چلا آیا۔

اس شام دونوں رات دو بجے تک باتیں کرتے رہے سارا نے اسے زندگی کی کچھ اور ٹھوکروں کی کہانی سنائی اور کچھ تلخیوں کا ذکر کیا۔ وہ اب رابرٹ کے اتنے قریب آچکی تھی کہ اپنی مجروح رُوح سے پردہ ہٹا سکے سارا کا یہ خیال تھا کہ ہر قدم پر انسانوں نے اسے دھتکارا تھا اسے وہ دن بخوبی یاد تھا جس دن اس نے اسکول کو الوداع کہا تھا وہ رابرٹ کو بتانے لگی ''میری ایک بدقسمتی یہ تھی کہ میں عقلمند تھی اور کلاس میں اول آیا کرتی تھی۔ میری سیاہ رنگت کی وجہ سے لڑکیاں مجھ سے ویسے ہی دور رہتی تھیں اور جب میں نے کلاس میں اول آنا شروع کیا تو نفرت میں رشک وحسد کا زہر بھی گھل گیا اور میں ان کے ہنسی مذاق کا نشانہ بننے لگی آخر ایک سال جب نتائج کا اعلان ہوا اور میں ایک دفعہ پھر اول آئی تو سب طالبات نے مجھ پر قہقہے لگائے اور اسکول ختم ہونے کے بعد مجھ پر پتھر پھینکے اس دن میرے پاؤں زخمی ہو گئے اور میرا دل ٹوٹ گیا اس دن کے بعد میں نے اسکول جانا ترک کر دیا۔''

اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے بھی وہ آبدیدہ ہو گئی — رابرٹ نے گفتگو کا موضوع بدل دیا تاکہ وہ زیادہ پریشان نہ ہو۔

رابرٹ جتنا زیادہ وقت سارا کے ساتھ گزارتا اسے اس کی شخصیت کے ڈھکے چھپے گوشوں میں جھانکنے کا موقع ملتا۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ سارا کیوں زندگی اور انسانوں سے بددل ہے۔

بڈی کی ٹانگ بہتر ہو رہی تھی اور سارا کی زندگی معمول پر آرہی تھی آخر وہ اسے دوبارہ سیر کے لیے ساتھ لے جانے لگی۔ رابرٹ نے سکھ کا سانس لیا یہ علیحدہ بات کہ وہ سوچتا رہا کہ سارا بڈی کے بغیر کیا کرتی۔

چند دن معمول کے مطابق گزرے رابرٹ کی شام کو سارا اور بڈی سے ملاقات ہونے لگی اور گفتگو کا سلسلہ دوبارہ جاری ہونے لگا بڈی پوری طرح صحتمند تو نہیں تھا لیکن بہتر ہو رہا تھا۔

ایک دن پھر اچانک سارا اور بڈی کو غیر حاضر پا کر رابرٹ کا ماتھا ٹھنکا لیکن اس نے

زیادہ اہمیت نہ دی دوسرے دن وہ زیادہ مصروف تھا اس لیے احوال پرسی نہ کر سکا تیسرے دن جب اس نے پھر سارا کی شکل نہ دیکھی تو وہ ان کے گھر گیا اس دفعہ اس کی حالت پہلے سے بھی بدتر تھی بڈی بہت زیادہ بیمار تھا اس کے زخم میں پیپ پڑ گئی تھی جسم بخار سے دہک رہا تھا بال جھڑنے شروع ہو گئے تھے اور وہ زبان نکال کر ہانپ رہا تھا سارا کی حالت اس سے بھی بدتر تھی وہ مرغِ بسمل کی طرح بیکل تھی جونہی اس نے رابرٹ کو دیکھا اس کے گلے سے لگ گئی اور دھاڑیں مار کر رونے لگی وہ بہت مایوس و ناامید ہو چکی تھی رابرٹ نے اس کی ہمت بندھانے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ سارا کافی دیر تک روتی رہی جب وہ بات کرنے کے قابل ہوئی تو کہنے لگی "رابرٹ بڈی کے آخری دن آ گئے ہیں اب ہم کچھ نہیں کر سکتے تم نہیں جانتے یہ مجھے کتنا عزیز تھا اس نے مجھے اس وقت سہارا دیا تھا جب میں زندگی اور انسانوں سے بالکل ناامید ہو چکی تھی جب میں مشکل میں تھی اس نے مجھے ڈھارس دی تھی اور آج وہ مر رہا ہے لیکن میں کچھ نہیں کر سکتی۔"

رابرٹ سب کچھ سنتا رہا لیکن خاموش رہا اسے بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ بڈی کچھ عرصے کا مہمان ہے اور وہ سارا کو جھوٹی تسلیاں نہیں دینا چاہتا تھا۔ اسے آج تک یہ پتہ نہیں چلا تھا کہ سارا کو بڈی کہاں ملا تھا اور وہ اسے بڈی کہہ کر کیوں بلاتی تھی اس نے پوچھا "سارا تمھیں بڈی کہاں ملا تھا؟"

سارا پہلے تو خاموش رہی پھر لمبی سانس لے کر بولی "یہ ایک طویل کہانی ہے یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں زندگی سے ناامید ہو رہی تھی اور انسانوں کے سلوک سے تنگ آ چکی تھی لیکن پھر بھی ہمت نہیں ہارنا چاہتی تھی میں اپنے آپ کو یقین دلانا چاہتی تھی کہ دنیا میں ابھی بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جنھیں انسانوں سے پیار ہے اور انسانیت سے دوستی۔ چنانچہ میں نے ایک نرسنگ ہوم میں کام کرنے کے لیے درخواست دی میں عمر رسیدہ انسانوں کی خدمت کرنا چاہتی تھی وہ نرسنگ ہوم رومن کیتھولک چرچ کی زیرِ نگرانی کام کر رہا تھا انھوں نے مجھے انٹرویو کے لیے بلایا ایک نن نے سوال پوچھنے شروع کیے :

تمھارا نام ؟ سارا

عمر ؟ ۶۱ برس

مذہب انسانیت

اس جواب پر اس نے میری طرف گھور کر دیکھا اور پھر پوچھا "تم یہودی ہو، مسلمان یا عیسائی" میں نے جواب دیا "سب کچھ" پھر سوچ کر کہا "کچھ بھی نہیں" وہ زیادہ خوش نظر نہ آئی بہرحال انھوں نے مجھے کام کرنے کی اجازت دے دی میں اکثر شام یا رات کی ڈیوٹی دیا کرتی تھی چونکہ وہ جگہ گرجے کی زیرِ نگرانی تھی اس میں بیسیوں قوانین تھے یہ کرو یہ نہ کرو اس وقت کھانا کھاؤ اس لمحے نیند کر دو مجھے

یہ قوانین پسند نہ تھے لیکن میں مجبور تھی کہ ان پر عمل کروں کیونکہ میں وہاں ملازم تھی میں نے انھیں بدلنے
کی کوشش کی لیکن میری جدوجہد کارآمد ثابت نہ ہوئی آخر ایک دن ایسا واقعہ پیش آیا جس نے سب
حالات بدل کر رکھ دیے۔ ایک بوڑھے آدمی کو اس کے بیٹے کی موت کی خبر آئی اور بہت پریشان تھا
اس نے اپنے بیٹے کو دو سال سے نہ دیکھا تھا وہ رات بھر روتا رہا اس نے سگریٹ پینے چاہے
نرسنگ ہوم کا قانون تھا کہ گیارہ بجے کے بعد سگریٹ دینے کی اجازت نہ تھی لیکن اس کی حالت
اتنی خراب تھی کہ میں نے اس کو سگریٹ دے دیے۔ اگلے دن میری رپورٹ ہوئی میں نے بہت دلیلیں
پیش کیں لیکن سب بے سود مجھے ملازمت سے نکال دیا گیا کہنے لگے تم نے قانون کی خلاف ورزی کی
ہے میں نے بہت پوچھنا چاہا کہ کیا انسان قوانین کے لیے بنے ہیں یا قوانین انسانوں کے لیے مجھے کوئی
تسلی بخش جواب نہ ملا۔ میں نے سب ملازمین کو جمع کیا اور انسانیت کے نام پر ان کے تعاون کی
درخواست کی لیکن ان کا کہنا تھا کہ چونکہ تمھارا مذہب عیسائیت نہیں تم اس نرسنگ ہوم میں
کام نہ ہی کرو تو بہتر ہے یہ سب باتیں سن کر میں اپنا سا منہ لے کر رہ گئی اور بہت دل شکستہ ہو کر
نرسنگ ہوم سے نکلی۔ میرے دل کے انسان دوستی کے سب آئینے چکنا چور ہو گئے میں اس
جگہ انسانیت کے مستقبل سے مایوس کافی دیر تک کھڑی رہی مجھے ایسا لگا میں ساری دنیا میں تنہا ہوں
اور مجھے کوئی شخص خلوص و محبت کی بھیک دینے کے لیے بھی تیار نہیں ہے میں اس موڑ پر کھڑی تھی
کہ ایک کالا کتا میرے قریب آیا اور میرے پاؤں چاٹنے لگا میں اتنی غصے میں تھی کہ اس کتے کو
بھی ٹھوکر لگائی وہ پھر لوٹ کر آیا میں نے پھر دھتکار دیا وہ جب تیسری دفعہ آکر میرے پاؤں سے
کھیلنے لگا تو میں نے اپنی توجہ اس کی طرف مرکوز کی —— مجھے اسے دیکھ کر اپنا بچپن کا وہ بھوس
کا بھرا ہوا کالا خرگوش یاد آیا جس کو میں لے کر اپنے ساتھ پھرا کرتی تھی اور جس کے بغیر میں سو بھی
نہیں سکتی تھی وہ میری تنہائیوں کا رفیق تھا میں اسے بڈی کہا کرتی تھی —— آخر میں نے اس
کتے کو اپنی گود میں اٹھایا تو وہ میرے ہاتھ چاٹنے لگا میں اسے اٹھا کر اپنے گھر لے آئی —— میں بوسٹن
سے اتنی بد دل ہوئی کہ وہاں کا گھر بیچ کر سینٹ انڈریوز چلی آئی اور اپنے ساتھ بڈی کو بھی لے آئی
وہ دن اور آج کا دن —— میں نے ایک کتے سے اتنی چاہت وصول کی جتنی انسانوں سے نہیں۔"
سارا ایک دفعہ پھر آبدیدہ تھی۔

رابرٹ نے ڈھارس بندھائی اور گھر چلا آیا۔

اسے احساس تھا کہ بڈی کا نزع کا عالم ہے۔

اگلے دن رابرٹ گیا تو اس کے خدشات حقیقت کا روپ اختیار کر چکے تھے سارا بڈی کے
لیے قبر کھود رہی تھی اور اس میں پھول بچھا رہی تھی۔

سارا ایسی مغموم تھی جیسے اس کا کوئی قریبی رشتہ دار چل بسا ہو۔ اس دن رابرٹ بھی آبدیدہ ہو گیا تھا۔

سارا چند دنوں کے لیے غم واندوہ کی گہرائیوں میں غرق ہو گئی۔ ایک دن رابرٹ سارا سے ملنے آیا تو کہنے لگا " سارا میرا کام ختم ہو گیا ہے میں کل واپس جا رہا ہوں "

سارا بے حس کھڑی تھی اس میں مزید جدائیاں سہنے کی ہمت باقی نہ رہی تھی۔ وہ خاموش رہی۔

رابرٹ پھر بولا " سارا تم تیاری شروع کر دو میرے ساتھ چلنا "

" کہاں ؟ " سارا نے آہستہ سے پوچھا۔

" ہمارے گھر۔ میں تمھیں اپنی بیوی اور بچوں سے ملاؤں گا "

" لیکن میں انھیں نہیں جانتی "

" وہ تو تمھیں جانتے ہیں میں ہر ہفتے اپنے خط میں تمھارا تذکرہ کرتا رہتا ہوں وہ تم سے ملنے کے بہت مشتاق ہیں "

سارا کی پلکوں پر آنسو لرزنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں کہ میں بڈی کی قبر کو چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں۔

" میں تمھیں ایک اور خبر سے بھی مطلع کرنا چاہتا ہوں " رابرٹ رازدارانہ لہجے میں بولا۔

" وہ کیا ؟ " سارا نے آہستہ سے پوچھا۔

" میں نے اور میری بیوی نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم آج سے اپنے بیٹے بریڈلی کو بڈی کہہ کر پکارا کریں گے "

سارا نے بے یقینی کے عالم میں رابرٹ کی طرف دیکھا لیکن اسے سنجیدہ پایا تو اس کی آنکھوں میں حیرت اور خوشی کے جذبات ابھرنے لگے۔

اگلے دن جب رابرٹ آیا تو سارا اس کے ساتھ جانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔

اکتوبر ۱۹۸۳ء

غدّار

جذبات کے خوابیدہ آتش فشاں ایک دفعہ پھر انگڑائی لے کر بیدار ہو گئے تھے جنگ کے شعلے دریا کے دونوں طرف کی بستیوں کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھے۔ نفرت کے پتھر، تعصب کے کنکر، انا کی ریت، حمیت کی چٹانیں اور موروثی خودداریوں کا دھواں لاوا بن کر بچوں، بوڑھوں، مردوں اور عورتوں —— سب ہی کی ظاہر و باطن کی آنکھوں کو خیرہ کیے جا رہا تھا۔ انسان اپنی زندگیوں میں ہی محشر کا منظر دیکھ رہے تھے۔

سعید بچپن کی گلیوں کو عبور کر کے نوجوانی کی شاہراہ تک پہنچ آیا تھا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں ہر چیز سراپا تجسس اور ہر لمحہ ایک سوال بن کر سامنے آتے تھے۔ اس کے لیے اس کی اپنی ذات، اپنا جسم، اپنا ذہن اور اپنا ماحول ہی نہیں بلکہ ساری کائنات معمہ بن کر رہ گئے تھے وہ ایک سوال کے جواب کی تلاش میں نکلتا تو دس سوال لے کر لوٹتا۔ وہ بذاتِ خود سراپا حیرت بن چکا تھا۔

وہ ابھی اپنی ذات سے ہی پوری طرح نبرد آزما نہ ہو پایا تھا کہ اس جنگ کے اچانک اعلان نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا اور کچھ سمجھ پاتا اس کے چاروں طرف بندوقوں کی گرج، توپوں کی گونج اور بارود کی بو نے ماحول کو بھیانک بنا دیا تھا۔ لوگ سارا دن خندقیں کھودتے رہتے اور رات بھر تاریکی میں دبکے رہتے۔ اس نے کئی لوگوں سے الٹے سیدھے سوال کر کے حالات کو معانی کا جامہ پہنانے کی کوشش بھی کی لیکن سب بے سود۔ سب کا کہنا تھا کہ ہم اپنی اقدار، اپنے مذہب اور قوم کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ اس راہ میں جان قربان کر دینا شہادت ہے اور اس میں شرکت کرنا سعادت۔ وہ اپنے باپ سے کئی سوال پوچھتا لیکن وہ تو فوجی کی حیثیت سے محاذ پر لڑ رہا تھا۔ سعید خاموش زبان، متحیر آنکھوں اور غیر یقینی ذہن سے حالات کا جائزہ لیتا رہا اور اس کسمپرسی کے بارود اور دھوئیں میں سانس لینے کی کوشش کرتا رہا۔

وہ جتنا اپنے بارے میں سوچتا اسے یہ اندازہ ہوتا جاتا کہ اسے بچپن سے شعوری و لاشعوری طور پر ان حالات کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ اسے اسکول کی پہلی جماعت کی دعا یاد آئی جب اسے خدا سے

اپنے لیے سکون کی التجا کرنا اور دشمنوں کے لیے ذلت و خواری کی دعا مانگنا سکھایا گیا تھا۔ اسے پرائمری اسکول کے اس ہیرو کا قصہ بھی یاد تھا جو دشمن کے بیسیوں مردوں کو قتل کرنے کے بعد ملک و مذہب کے لیے جان کی قربانی دے دیتا ہے اور ساری قوم اس کا مجسمہ بنا کر شہر کے وسط میں رکھ دیتی ہے اور مڈل اسکول میں جب وہ ورزش کے کلاس میں جاتا تو اس کے اساتذہ اسے ملٹری ڈرل کرواتے جس میں اسے بندوقوں کے استعمال کے ساتھ ساتھ دشمن پر ظلم و تشدد کرنے کے طریقے سکھائے گئے تھے۔ وہ کئی برسوں سے اس میں مشغول تھا لیکن اب اچانک ان کی اہمیت اس کے سطحِ ذہن پر ابھر رہی تھی۔ وہ اس ذہنی کشمکش میں نجانے کب تک غلطاں رہتا لیکن ایک شام نے اس کی سوچ کو ایک نئی ڈگر پر ڈال دیا تھا۔

اس شام وہ گھر لوٹا تو اپنے گھر والوں کو فسردہ اور رشتہ داروں کو گریہ کناں پایا۔ اس کا والد کمرے میں زخمی حالت میں لیٹا کراہ رہا تھا۔ اس نے اپنے والد کو اس سے پہلے کبھی بیمار نہ دیکھا تھا۔ اس نے والد کی طرف نگاہ اٹھائی تو اسے اس کے بازو اور سر سے خون ٹپکتا ہوا دکھائی دیا — وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ وہ اپنے والد سے " باپو " کہہ کر لپٹ گیا سب نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی لیکن سب بے سود۔ وہ بآوازِ بلند روتا رہا اور پھر غصے میں دروازے کو ٹھوکر مار کر باہر نکل گیا۔ وہ کافی دیر تک کھیتوں میں بھاگتا رہا اور دشمنوں کو گالیاں دیتا رہا " ذلیل، کتے، کمینے ان کی یہ مجال میرے باپو کو زخمی کریں۔ قتل کر دیں۔ میں اس کا بدلہ لے کر رہوں گا " آخر وہ شام کو دیر سے پریشان حال سوجی آنکھیں لے کر واپس لوٹا اور والد کی چارپائی کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کے والد پر نقاہت طاری تھی اس نے سعید سے پانی مانگا۔ سعید نے پانی پیش کیا تو اس کے والد نے کہا۔

" بیٹا میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں " اس کی آواز سے نقاہت عیاں تھی۔

" کیا بات ہے باپو " سعید ہمہ تن گوش تھا۔

" بیٹا رونا مردوں کا نہیں عورتوں کا کام ہے مرد لڑنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں " سعید خاموش رہا۔

" بیٹا! ہم نے عہد کر رکھا ہے کہ یہ جنگ جیت کر رہیں گے چاہے اس کو ایک سال لگے یا سو سال۔ جنگ میں مر جانا شہادت ہے اور بھاگ جانا بزدلی " سعید نے کبھی باپ کو ایسی باتیں کرتے نہ سنا تھا وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ باپ نے اسے پھر قریب بلایا اور لرزتی ہوئی آواز سے کہا۔

" سعید میری بندوق آج سے تمھاری ہے صرف ایک وعدہ کرو "

" وہ کیا باپو "

" تم اپنی ذات سے اور قوم سے کبھی غداری نہیں کرو گے "

"میں وعدہ کرتا ہوں۔"

"بیٹا اب میں سکون سے مر سکتا ہوں۔" اس نے بڑھ کر سعید کی پیشانی کو بوسہ دیا اور پھر پہلو بدل کر ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

سعید پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ باقی رشتہ داروں کو بلا سکتا۔ تھوڑی دیر کے بعد باقی لوگ آئے تو انھیں اندازہ ہوا کہ مریض ہمیشہ کے لیے لب بستہ ہو چکا تھا۔

اس واقعہ کے بعد کئی ہفتوں تک سعید بہت بے قرار رہا۔ نہ اسے دن کو آرام آتا نہ رات کو چین۔ وہ گھنٹوں گلیوں بازاروں میں بے معنی گھوما کرتا، وہ درختوں پر چڑھتا، جانوروں کو پتھر مارتا، فضاؤں میں گھورتا رہتا اور راتوں کو بھیانک خواب دیکھتا جس میں وہ اپنے باپو کے قاتلوں کا متلاشی رہتا اس کے ذہن میں نفرتوں کا اور دل میں آنسوؤں کا سیلاب موجزن تھا لیکن وہ کھویا کھویا سا رہتا۔ اسے کبھی ایسے حالات سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس کے باپو نے نہ رونے کی پابندی لگا کر اسے اور بھی مجبور کر دیا تھا۔

جب طوفان میں قدرے ٹھہراؤ پیدا ہوا تو اس نے سنجیدگی سے مستقبل کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ فیصلہ کرنا اتنا مشکل نہ تھا اس نے اپنے باپ کی بندوق اٹھائی اور فوج میں بطور سپاہی بھرتی ہو گیا۔

فوج کی جسموں کی منڈی میں ایک اور جسم کا اضافہ۔

وہ نوجوان تھا لیکن باقی سب نوجوانوں سے مختلف، اس کی زندگی میں ایک لگن تھی، ذہن تھی، مقصدیت تھی — وہ فوج میں وقت گزارنے یا تلاش معاش کی غرض سے شامل نہیں ہوا تھا — اس کے باپ کی موت نے اس کی ذات میں جذبات کا تلاطم برپا کر رکھا تھا، وہ ہر کام سنجیدگی سے کرتا، گھنٹوں ورزش کرتا، فوجی ڈرل میں شامل ہونا اور ایک کامیاب فوجی بن کر جنگ میں حصہ لینے کے خواب دیکھنا اس کا معمول تھا۔

وہ جب پہلی جنگ میں شریک ہوا اور اپنے بیسیوں دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار آیا تو بہت خوش تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دشمنوں سے بدلہ لینے کے ساتھ ساتھ اپنے بزرگوں کی روایات کو تازہ رکھ کر قوم کی خدمت بھی کر رہا ہو۔

اس نے کئی جنگوں میں حصہ لیا اور ہر جنگ میں وہ جوہر دکھائے کہ فوج میں اس کے نام کے چرچے ہونے لگے اسے وقت سے پہلے ہی کپتان بنا دیا گیا اس کی تنخواہ میں بھی اضافہ ہو گیا۔

اس کے عہدے اور تنخواہ کی ترقی کو دیکھ کر اس کے خاندان والوں کو اس کی شادی کا فکر لاحق ہوا رشتہ تلاش کیا گیا اور اس کی شادی کر دی گئی وہ بہت خوش تھا اس لیے نہیں کہ اسے شادی

کا شوق تھا بلکہ اس لیے کہ وہ ایسے بیٹے کا باپ بننا چاہتا تھا جو بڑا ہو کر فوجی بن سکے، اس کی بندوق استعمال کر سکے اور محاذ پر جا کر اپنے باپ دادا کے نقش قدم پر چل سکے۔

جنگوں کا سلسلہ جاری رہا۔ سعید بڑی جانفشانی سے حصّہ لیتا رہا۔ ایک طرف وہ فوج میں ترقی کی منزلیں طے کر رہا تھا دوسری طرف وہ بیٹا پا کر بہت خوش ہوا تھا اور اسے فوجی بنانے کے منصوبے بنا رہا تھا — ترقی کرتے کرتے وہ جرنیل کے عہدے تک پہنچ گیا۔ وہ فوج میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ سب اس کی فوجی قابلیت اور لیڈرانہ صلاحیتوں کے قائل ہو گئے تھے۔ وہ جس محاذ پر جاتا کامیاب لوٹتا — سب اسے اچھا شگون سمجھنے لگے تھے۔ اس کا ملک وملّت اور مذہب سے لگاؤ مثالی بن گیا تھا۔

وہ چالیس سال کی عمر میں جرنیل کے عہدے تک پہنچ گیا تھا وہ پانچ جرنیلوں میں سے ایک تھا اور سب سے چھوٹی عمر کا۔ ساری قوم اسے فخر کی نگاہ سے دیکھنے لگی تھی۔

وہ اپنے بیٹے کو پلتا بڑھتا دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سماتا اور اسے فوج کے قصّے سنا کر اپنی انا کو تسکین پہنچانے کی صورت پیدا کرتا۔

جنگ کی کیفیت بوڑھوں کے دمے کی مرض کی طرح تھی — حالات ناخوشگوار ہوتے تو طبیعت ابتر ہو جاتی، موسم اچھا ہوتا تو عوارض کم ہو جاتے لیکن پوری طرح شفا کبھی نہ ہوتی — ایک محاذ پر جنگ سنگین صورت اختیار کر گئی۔ شکست کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ جب حالات قابو میں نہ آتے دکھائی دیے تو کمانڈر ان چیف نے سعید کو اس محاذ پر بھیجا — سعید نے بڑی خوشی سے یہ امتحان قبول کیا۔ پہلے چند دن تو وہ حالات کا جائزہ لیتا رہا پھر وہ صفِ اول کے سپاہیوں کے ساتھ اتفاقیہ ملاقات کے لیے گیا لیکن وہ ملاقات حادثے کا پیغام لے کر آئی۔ دشمن نے اتفاقاً ایک بڑے وسیع پیمانے پر حملہ کر دیا مدافعت بڑے زور شور سے کی گئی لیکن اس دوران سعید بری طرح زخمی ہو گیا۔ اسے بے ہوشی کی حالت میں واپس لایا گیا۔

سعید کا بری طرح زخمی ہونا ساری فوج کے لیے حادثہ تھا۔ وہ اس فوجی جرنیل کو کھونا نہیں چاہتے تھے۔ وہ سعید سے مستقبل میں بڑی امیدیں وابستہ کیے ہوئے تھے اعلیٰ افسروں کا ہنگامی اجلاس ہوا اور فیصلہ کیا گیا کہ سعید کو فوراً سات سمندر پار ایک اعلیٰ ہسپتال بھیجا جائے تاکہ اس کی پوری طرح نگہداشت ہو سکے۔ اسی رات ایک فوجی جہاز اسے لے کر دوسرے ملک پہنچا آیا جہاں اسے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ وہ اس وقت بھی بیہوش تھا۔

سعید کئی دن تک بے ہوش رہا۔ وہ کافی دیر تک موت اور زندگی کی جنگ لڑتا رہا۔ ڈاکٹر کئی دفعہ ناامید ہو گئے لیکن آخر کار زندگی کی توانائی نے غلبہ پا لیا۔ سعید نے کئی دنوں کے بعد آنکھیں کھولیں تو اس کا استقبال ایک ادھیڑ عمر کی دبلی پتلی عورت نے کیا جس کے چہرے پر مادرانہ شفقت کا نور پھیلا ہوا تھا

سعید کے پوچھنے پر اس نے تفاصیل بتائیں۔ اس نے بتایا کہ وہ جنگ میں حادثے کا شکار ہو گیا تھا اور اب ہسپتال میں زیرِ علاج تھا — سعید نے سکھ کا سانس لیا۔

شروع میں سعید سمجھا کہ وہ عورت ایک نرس ہے لیکن بعد میں اس کی نرس نے بتایا کہ وہ عورت ایک رضا کار تھی۔ وہ مریضوں کی مزاج پرسی کے لیے آیا کرتی تھی لیکن جب سے سعید داخل ہوا تھا وہ اپنا بہت سا وقت سعید کے پاس گزارتی تھی وہ اس کے علاج میں نرسوں کی مدد کرتی اور ہمیشہ دست بدعا رہتی۔ نرسیں اس کی بہت ممنون تھیں۔ نرسوں سے اس عورت کی تعریف سُن کر وہ بہت متاثر ہوا تھا اسے یقین ہو گیا تھا کہ اسے دوبارہ زندگی ملنے میں اس عورت کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

سعید کی طبیعت سنبھل رہی تھی لیکن ابھی بھی نقاہت کا غلبہ تھا۔ وہ بمشکل بات چیت کر سکتا تھا اس نے ایک دن عورت سے پوچھا:

آپ کا نام؟

وہ مسکرائی "رفیقہ"

اگرچہ سعید اپنے ملک سے دور تھا لیکن اسے رفیقہ کے چہرے میں اپنی بستی اور قوم کی عورتوں کے نقوش نظر آ رہے تھے اس نے آخر پوچھ ہی لیا۔

"آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟"

وہ ایک دفعہ پھر مسکرائی اور بولی "جہاں اپنوں اور بیگانوں کی تمیز بہت مشکل ہے" اتنا کہنے کے بعد وہ دوا لینے کمرے سے باہر چلی گئی۔

سعید سمجھ گیا کہ وہ اشاروں کنایوں میں بات کرنا پسند کرتی تھی۔

چند دنوں کے بعد اس نے ایک اور سوال پوچھا "رفیقہ! اپنوں اور پرایوں میں تمیز کرنا کب مشکل ہو جاتا ہے؟" اس نے سعید کے چہرے کی طرف بڑے غور سے دیکھا پھر بولی "سعید میاں جب انسان کی نظر کا مرکز انسانیت نہیں رہتا اور اس کی آنکھوں پر خود غرضی کی عینک لگ جاتی ہے تو وہ دوست اور دشمن میں تمیز کھو دیتا ہے۔"

سعید نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک اور سوال پوچھ لیا "رفیقہ تمھارے خیال میں اس بات کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟"

رفیقہ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولی "انسان اپنوں سے لڑ لڑ کر مر جاتے ہیں — اور یہ سلسلہ بعض دفعہ نسل در نسل صدیوں تک چلتا رہتا ہے۔ ایسے حالات ایسی ذہنیت پیدا کرتے ہیں جو ہر برے فعل کو اچھا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مفاد پرستی کو محب الوطنی، خود غرضی کو حق پرستی جنگ کو جہاد اور خودکشی کو شہادت کے نام دے دیے جاتے ہیں" یہ کہتے ہوئے رفیقہ کی آواز میں رقت

پیدا ہوگئی اور وہ آنسو بہاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

عام حالات میں شاید سعید ان باتوں پر زیادہ غور نہ کرتا لیکن اس کی بیماری اور تنہائی کی طویل گھڑیوں، اس شفیق عورت کے کردار اور اس کی بے لوث محبت نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا ـــــ وہ عورت بڑے پیار سے سعید کے عمر بھر کے نظریات کو للکار رہی تھی سعید نے پہلے کچھ دن تو ان باتوں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی لیکن وہ سب باتیں چور دروازے سے اس کے ذہن میں گھس آئیں ان باتوں سے صداقت کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں لیکن سعید کے ساری عمر کے اعمال ایک دبیز تہہ بن کر اس کے قلب و ذہن پر چھائے ہوئے تھے۔

جب سعید کی طبیعت سنبھل گئی تھی تو ایک دن اس نے رفیقہ کو رکنے پر مجبور کیا اور اس سے صاف صاف پوچھا کہ وہ کون ہے اور اس کا اتنا خیال کیوں رکھتی ہے۔ رفیقہ پہلے تو کچھ ہچکچائی لیکن پھر اپنے آنسوؤں کا سہارا لیتے ہوئے اپنی رام کہانی سنانے لگی۔ رفیقہ کا تعلق دریا کے اس پار سعید کے دشمنوں کی بستی سے تھا رفیقہ نے بتایا کہ اس کا خاوند اور دو بیٹے سعید کی بستی سے جنگ کرتے ہوئے مارے گئے تھے رفیقہ حالات سے اتنی دل شکستہ ہوئی تھی کہ اس علاقے کو ہی چھوڑ آئی تھی۔ وہ سعید کے نام اور فوج کے جرنیل ہونے سے بخوبی واقف تھی ـــــ علاقہ چھوڑنے کے بعد اسے ان حقائق سے آگاہی حاصل ہوئی تھی کہ صدیوں پہلے دریا کے دونوں طرف کی بستیوں کے لوگ ایک ہی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے رسوم و رواج ایک ہی طرح کے تھے، وہ ایک ہی زبان بولتے تھے اور ایک ہی مذہب کی پیروی کرتے تھے۔ اس کے بعد حالات کی مجبوریوں کی وجہ سے قبیلے کا ایک حصہ دریا کے اس پار چلا گیا ـــــ پہلے اختلاف الرائے پیدا ہوا اور آہستہ آہستہ نفرتوں کے بیج بوئے گئے جنھوں نے جنگ اور قتل و غارت کے درختوں کو جنم دیا اور اب مدتوں سے جانبین ان کا کڑوا پھل کھا رہے تھے۔ رفیقہ نے بہت سی ایسی تاریخی کتابیں بھی جمع کر رکھی تھیں جو اس کی باتوں کی تصدیق کرتی تھیں۔

رفیقہ کا ایمان تھا کہ جب تک ایک قوم دوسری قوم کو موردِ الزام ٹھہراتی رہے گی جنگ کبھی ختم نہیں ہوگی۔ جس دن ایک جانب نے دشمن کو دوست سمجھنا شروع کر دیا اور لڑنے سے انکار کر دیا دوسری جانب بھی کچھ عرصے کے بعد ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائے گی۔

"تم نے میرا اتنا خیال کیوں رکھا؟" سعید نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"سعید! ہم ایک ہی قبیلۂ انسانی کا حصہ ہیں اگر میں تمھارا خیال نہیں رکھوں گی تو اور کون رکھے گا" اس نے بڑھ کر سعید کی پیشانی کو بوسہ دیا۔

سعید کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔

سعید اگلے کئی ہفتے وہاں ٹھہرا۔ اس کے زخم مندمل ہو رہے تھے۔ وہ جسمانی طور پر صحتیاب اور طاقتور

ہوتا جارہا تھا لیکن اس سے زیادہ اہم وہ جذباتی و نظریاتی انقلاب تھا جو ایک دفعہ شروع ہوا تو پھر رکنے کا نام ہی نہ لیتا تھا — ان چند مہینوں میں اس کا صرف نقطۂ نظر ہی نہیں بلکہ نظریۂ زندگی ہی بدل چکا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک ادھیڑ عمر کی اجنبی عورت اس کی زندگی میں ایسا انقلاب پیدا کرے گی۔

وہ کئی راتیں بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔

وہ صدیوں کے موروثی جذبات سے دست و گریباں تھا۔

حقیقت قطرہ قطرہ ٹپک کر اس کے ذہن پر جمی ہوئی تعصب کی برف کو پگھلاتی رہی۔

محبت کی چنگاریاں رنجشوں کی کاغذی دیواروں کو جلا کر راکھ بناتی رہیں۔

اور جب وہ اس آگہی کے کرب کی سرنگوں سے نکلا تو اس کا ذہن نکھرا ہوا تھا، اس کی ذات ہشاش بشاش تھی اور اس کی روح کو جیسے نئی زندگی ملی تھی۔

وہ اصول، قوانین اور نظریات جن کو وہ آہنی چٹانیں سمجھا ہوا تھا ریت کی دیواروں کی طرح مسمار ہو گئے تھے۔

جس دن وہ واپس جا رہا تھا اس نے رفیقہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا تھا اور پوچھا تھا "میرے لائق کوئی خدمت" رفیقہ نے مختصر سا جواب دیا تھا "اگر ہو سکے تو میرا پیغام اپنے ساتھیوں میرے دوستوں تک پہنچا دینا۔"

سعید اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ اس پیغام کی کیا قیمت ادا کرنی ہو گی۔

سعید واپس لوٹا تو سب لوگ اس کی راہ تک رہے تھے سب فوجی مسرور تھے کہ ان کا جرنیل لوٹ آیا ہے۔ رشتہ دار سعید کو زندہ و سلامت دیکھ کر پھولے نہ سماتے تھے سب سے زیادہ خوش اس کا نوجوان بیٹا تھا جو اس طویل عرصے کے بعد باپ کی صورت دیکھ کر مسرت سے چھلانگیں لگا رہا تھا وہ باپ سے گلے لپٹ کر کافی دیر تک خوشی کے آنسو بہاتا رہا۔ بیٹے کو دیکھ کر سعید کو اپنی جوانی کا وہ دور یاد آگیا تھا جہاں ہر چیز سراپا تجسس اور ہر لمحہ بڑا سوال بن کر سامنے آتے تھے جب اس کی اپنی ذات اور ساری کائنات معمّے سے کم نہیں تھے جب وہ ایک سوال کے جواب کی تلاش میں نکلتا تو دس مزید سوال لے کر لوٹتا۔ سعید سوچ رہا تھا کہ اس نے اپنے باپ سے کیا سیکھا تھا اور اب اپنے بیٹے کو کیا ورثے میں دینا چاہتا تھا۔

اس کے بیٹے کو فخر تھا کہ بابو دوبارہ فوج میں شامل ہونے کے قابل ہو گیا ہے لیکن سعید بخوبی جانتا تھا کہ پچھلے چند مہینوں میں اس کے نظریات بدل چکے تھے اور جنگ کے حق کے سب دلائل اس کی نظروں میں ریت کی دیواروں اور جھاگ کے بلبلوں کی طرح بیٹھ گئے تھے۔

اگلے دن اسے ٹیلی ویژن پر وہاں کے قومی پروگرام میں بطور مہمانِ خصوصی بلایا گیا تھا۔ وہ انٹرویو سعید کی اور اس قوم کی زندگی کے لیے ایک نازک موڑ ثابت ہوا۔ سعید نے پہلے تو فوج اور

عوام کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے اتنے خلوص ومحبت سے اس کا علاج کروایا اور اسے نئی زندگی بخشی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس بات کا بھی ممنون تھا کہ وہ اس کے نظریات کی تبدیلی کا باعث بنے۔ اس نے انھیں بتایا کہ اس سفر کے دوران اس کی ملاقات دشمنوں کی ایک عورت سے ہوئی جس کے خاندان کے تین افراد جنگ میں کام آئے تھے اس کے باوجود اس عورت نے سعید کی دن رات خدمت کی تھی —— سعید نے قوم کو جنگ کا فوجی اور سیاسی پسِ منظر اجاگر کرتے ہوئے بتایا کہ ایک وہ دور تھا جب دونوں بستیاں ایک ہی قبیلہ ہوا کرتی تھیں، رسم ورواج، زبان اور مذہب کا اشتراک ان کی زندگی کا جزوِ لاینفک ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد اختلافات کے بیج بوئے گئے —— دوست دشمن بن گئے اپنے پرائے ہوگئے اور دوست دوستوں کے خون کے پیاسے ہوگئے —— ایسے حالات میں خودداریاں، تعصب، ملک و مذہب کی محبت، چنگاریوں کو ہوا دینے کے لیے کافی تھے جن سے جنگ کے شعلوں نے جنم لیا، اور یہ شعلے صدیوں سے نسل در نسل منتقل ہوتے گئے۔

سعید نے بتایا کہ ان جذبات کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ انھیں سمجھنے کے لیے بھی طویل عرصے کی ضرورت ہے وہ خود بھی ہفتوں شام سے صبح تک جاگتا، کروٹیں بدلتا اور سوچتا رہا تھا۔ کئی باتیں ذہن مانتا تھا لیکن دل نہ مانتا تھا اور کئی باتیں دل مانتا تھا لیکن ذہن قبول نہ کرتا تھا —— آخر اس جاں گسل سفر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے اس نے کہا "اگر ہم خود جنگ سے دست کش ہوجائیں تو ہمارے مخالف بھی جنگ سے اجتناب کرنے پر مجبور ہوجائیں گے اور اس طرح مستقل امن کی داغ بیل ڈال سکیں گے۔"

سعید ابھی اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ اسے بات کرنے سے روک دیا گیا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد اسے حراست میں لے لیا گیا —— گھر والوں پر یہ خبر بجلی بن کر گری کہ سعید قید میں ہے اور اس پر غدار ہونے کا مقدّمہ چلایا جائے گا۔

ایک طرف گھر میں افراتفری کا عالم تھا تو دوسری طرف پوری قوم میں ایک قیامت کا سا سماں تھا ایک دن وہ سب کا ہیرو تھا اور دوسرے دن اس پر غداری کا الزام لگایا گیا تھا۔ ہر شخص حیران پریشان تھا۔

اگلے دن سعید فوجی عدالت میں پیش ہوا۔ اس نے جنگ میں دوبارہ شریک ہونے سے انکار کردیا اور فوج کو جنگ سے دستبردار ہونے کی درخواست کی۔ اس نے عدالت میں دشمنوں کا "اپنے ہی قبیلے کے افراد" اور "بھائی" کہہ کر ذکر کیا —— قانون کے مطابق اسے غدار قرار دے دیا گیا اور سزائے قتل کا فیصلہ سُنا دیا گیا۔

اس کی زندگی کے چوبیس گھنٹے باقی تھے۔ اسے احباب سے ملنے کے لیے صرف آدھ گھنٹہ دیا گیا تھا۔ بہت سے دوست اور احباب ملنے آئے۔ سعید نے آخری پانچ منٹ اپنے بیٹے کے ساتھ گزارنے کی

خواہش ظاہر کی۔ نوجوان بیٹا شدّتِ جذبات سے رو رہا تھا۔ وہ باپ سے ملنے آیا۔ باپ سلاخوں کے ایک طرف اور بیٹا دوسری طرف۔

"باپو! یہ تم نے کیا کیا؟" بیٹے کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

"کیا بیٹا؟" باپ کی آواز میں تمکنت تھی۔

"تم نے نہ صرف فوج میں جانے سے انکار کیا بلکہ دشمنوں کی تعریف بھی کی۔"

"بیٹا۔ وہ دشمن نہیں ہمارے بھائی ہیں — اپنے بھائیوں کو قتل کرنا کہاں کا انصاف ہے۔"

"باپو! لیکن تم ہی تو برسوں سے انھیں قتل کرتے رہے ہو۔"

"بیٹا برسوں سے ہی نہیں ہمارے آبا و اجداد صدیوں سے ایسا کرتے آئے ہیں لیکن ایک دن اس المیے کو ختم ہونا ہے ہم ایسی اجتماعی خودکشی کب تک کرتے رہیں گے۔"

"لیکن باپو ٹیلی ویژن پر ایسی باتیں کرنا کہاں کی عقلمندی تھی۔"

"بیٹا میں قوم کا جرنیل تھا میں نے بیسیوں ایسی تقریریں کی تھیں جن میں عوام اور فوج کو جنگ کی دعوت دی تھی اب میں انھیں بتا دینا چاہتا تھا کہ میرے نظریات بدل گئے ہیں اور میں اپنے ماضی پر نادم ہوں۔ میرے لیے یہ بات باعثِ سکون ہے کہ میں نے اپنا اور اپنی محسنہ رفیقہ کا پیغام سب تک پہنچا دیا۔ بیٹا اگر کبھی موقع ملے تو اس عظیم عورت سے ضرور ملنا۔"

"باپو کیا تم اپنی جان رائگاں قربان نہیں کر رہے۔"

"نہیں بیٹا، تعصب، خودغرضی اور جہالت کی وجہ سے ہزاروں جانیں ضائع ہوئی ہیں یہ پہلی جان ہوگی جو حق و صداقت کی خاطر قربان ہوگی اور تم دیکھو گے کہ یہ کیا رنگ لائے گی۔"

"باپو تم کہا کرتے تھے کہ دادا جان نے تم سے وعدہ لیا تھا کہ کبھی غداری نہ کرنا۔"

"ہاں بیٹا اگر میں سب کے سامنے وہ باتیں نہ کرتا تو غداری کرتا۔"

فوجی دربان نے کہا کہ ایک منٹ باقی ہے۔ سعید نے محبت بھری نگاہوں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔

"بیٹا میری ایک آخری خواہش ہے۔"

"وہ کیا باپو؟"

"میرے ساتھ خاندان کی ساری بندوقیں دفن کر دینا۔"

بیٹا کچھ دیر سوچتا رہا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"اچھا باپو" اس نے دل پر جبر کر کے کہا۔

دونوں نے ہاتھ ملائے (وہ سلاخوں کی وجہ سے گلے نہیں مل سکتے تھے) آبدیدہ نظروں سے خداحافظ کہا اور جدا ہو گئے۔

آدھی رات کو سعید کو قتل کر دیا گیا۔

بیٹے کو باپ کی باتیں سمجھ نہ آئیں۔ اس کا خیال تھا کہ باپ نے بہت جذباتیت اور بیوقوفی کا ثبوت دیا تھا لیکن اس کے پاس سرد آہوں اور گرم آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں تھا جو اب باپ کو واپس لانے کے لیے ناکافی تھے۔

وہ بہت سے نہ سمجھ آنے والے سوالوں میں محصور ہو کر رہ گیا تھا۔

کئی ہفتوں کے بعد جب اس نے یہ خبر سُنی کہ اس کے باپو کی تقریر اور سزائے موت کے بعد بڑھتی ہوئی تعداد میں فوجیوں نے استعفیٰ دینا شروع کر دیا تھا تو اس کی حیرت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

کیا اس کے باپ کی پیشین گوئی درست تھی؟ وہ سراپا سوال بن گیا تھا۔

اپریل ۱۹۸۴ء

تاریخ کی چکّی کے دو پاٹ

مقام : جنوبی افریقہ
وقت : رات ۳ بجے

محمد حسین ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا
اس کا بدن کانپ رہا تھا اور بستر پسینے سے شرابور تھا
کیا میں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے ؟
اس نے یاد کرنے کی کوشش کی لیکن کچھ یاد نہ کر سکا
وہ اٹھا، کمرے کا چکر لگایا، دودھ کا گلاس پیا اور دوبارہ سوگیا۔
صبح ہونے میں ابھی بہت دیر تھی

صبح ۹ بجے

وہ کام پر جانے کے لیے تیار ہو چکا تو ملازم سے کہنے لگا
"کریم گاڑی باہر نکالو میں جا رہا ہوں۔"
"کون سی صاحب ؟"
"بڑی والی"
"اچھا حضور"

وہ کار میں بیٹھا اور اپنے کارخانے کی طرف جانے لگا ریڈیو پر سیاسی تبصرہ ہو رہا تھا "کسی سیاسی مفکر نے کہا ہے کہ تاریخ کسی کو معاف نہیں کرتی" اس نے ریڈیو بند کر دیا وہ اس فضول گفتگو سے اپنا ذہن پراگندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے راستے میں اپنے دوست فاروق کو اٹھایا۔ فاروق نے گفتگو کا آغاز کیا "کالوں نے بہت سے گوروں اور دوانڈینز کے گاؤں جلا دیے ہیں۔"

" ذلیل کہیں کے"، محمد حسین غصے میں بولا
" وہ بھلا کیوں ؟"
" وہ آخر چاہتے کیا ہیں ؟"
" زندگی کا حق - معاشرے میں برابری"
" خدا سے جا کر لڑیں - یہاں کوئی برابر نہیں ہے "
" لیکن کالے اپنے حقوق چاہتے ہیں"
" انھیں کھانے کو مل رہا ہے - رہنے کو جگہ ہے اور کیا چاہتے ہیں"
" وہ تعلیم اور کاروبار کا حق چاہتے ہیں"
" انھیں روکا کس نے ہے وہ سب جاہل اور ان پڑھ ہیں نشہ کرنا اور فضول وقت ضائع کرنا جانتے ہیں - تعلیم اور کاروبار کے لیے محنت کی ضرورت ہے "
" دولت کی بھی - وہ حکومت میں اختیار بھی چاہتے ہیں"
" یہ سب بکواس ہے - کالے تاریخ میں بھی نہیں اسلام میں بھی غلام ہی رہے ہیں"
" بلالِ حبشی کو تو اسلام نے بہت مرتبہ دیا تھا "
" ہاں موذن بنا دیا - خلیفہ تو نہیں بنایا نا ؟"
" تم تو گوروں سے بھی بدتر ہو وہ تو پھر بھی کھل کر ایسی باتیں نہیں کرتے "
" ہاں میں صاف گو ہوں" - " دل سے وہ بھی اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ کالوں میں نہ تو کوئی لیڈر ہے اور نہ ہی صلاحیت - انھیں حکومت مل بھی گئی تو ایک ہفتے سے زیادہ نہ چل سکے گی - انھیں بالکل تجربہ ہی نہیں ہے"
" انھیں جب سینکڑوں برس موقع ہی نہیں دیا گیا تو تجربہ کیسا ہوگا "
" اب بہت دیر ہو چکی ہے "
" زندگی میں دیر ہے اندھیر نہیں "

دن گیارہ بجے

فون کی گھنٹی بجی - محمد حسین نے ریسور اٹھایا -
" ہیلو - میں سلیم بول رہا ہوں "
" جی چچا جان - فرمائیے "
" بہت پریشانی کی خبر ملی ہے "

"کیا؟"

"کالوں نے پانچ اور بستیوں پر حملہ کرنے کا پروگرام بنایا ہے چار گوروں کی ہے اور ایک انڈینز کی۔ جہاں تمھاری کوٹھی ہے۔"

"افواہ ہوگی۔"

"نہیں مصدقہ خبر ہے۔"

"کب؟"

"یہ تو پتہ نہیں اگلے چند دنوں میں، میرا خیال ہے تم اپنے خاندان کو ملک سے باہر بھیج دو۔"

"کہاں"

"امریکہ اپنے بھائی کے پاس۔"

"لیکن بچے وہاں کیا کریں گے وہ تو یونیورسٹی میں ہیں۔"

"زندہ تو رہیں گے۔ تم جانتے ہو کہ ان دنوں کالوں میں انڈینز کے خلاف بہت غصے کے جذبات ہیں انھوں نے بہت سخت بیانات دیے ہیں اور تقریریں کی ہیں۔"

"کیا کہتے ہیں؟"

"کہتے ہیں انڈینز نے ہمارا ساتھ نہیں دیا، ہمیں نیچ سمجھا، دولت جمع کرتے رہے اور انگریزوں کا ساتھ دیتے رہے۔"

"بکواس کرتے ہیں۔"

"اس میں تھوڑا سا سچ بھی ہے۔ تمھارا باپ لکھ پتی تھا تم بھی لکھ پتی ہو تمھارا باپ انگریزوں کا معتمد تھا۔"

"اس لیے کہ وہ قابل آدمی تھا۔"

"قابلیت اپنی جگہ لیکن وہ ایک جابرانہ نظام کی کٹ پتلی تھا۔"

"لیکن سب انڈینز تو ایسے نہیں ہیں۔"

"مجموعی تعصب کے لیے چند مثالیں کافی ہوتی ہیں۔"

"لیکن انڈینز تو گوروں سے دور اور کالوں کے قریب رہے ہیں۔"

"مجبوراً۔ آج تک ایک انڈین نے بھی کالی عورت کے ساتھ شادی نہیں کی یہ علیحدہ بات ہے کہ بچے بہت سے پیدا کیے اس کے مقابلے میں بہت سی انگریز عورتوں سے شادی کر کے انگلینڈ چلے گئے۔"

"تو اب کیا ہوگا۔"

"ہر نسل کو پچھلی نسلوں کے قرض اتارنے پڑتے ہیں۔ ہم پر بھی یہ آزمائش آن پڑی ہے۔"

"تو اب کیا کرنا چاہیے۔"

"میں چاہتا ہوں تم اپنے بھائی کو امریکہ فون کرو اور خاندان کو وہاں بھیج دو۔ حالات تیزی سے بگڑتے جا رہے ہیں۔ میں جب تم سے ملوں گا تو تفصیلی گفتگو کروں گا۔"

"اچھا میں اپنے کونسلر دوست رابرٹ اور انگریز دوست ولیم سے مل کر ٹکٹوں اور ویزے کا انتظام کرتا ہوں۔"

"خدا حافظ"

"خدا حافظ"

شام ۵ بجے

محمد حسین رابرٹ سے ملنے جاتا ہے

"رابرٹ۔ میں اپنے خاندان کو امریکہ بھیجنا چاہتا ہوں ویزے کا انتظام کر دو۔"

"وہ کیوں؟"

"یہاں ان کی زندگی خطرے میں ہے امریکہ میں میرا بھائی ہے۔"

"کتنے عرصے کے لیے ویزا چاہیے۔"

"تین مہینوں کے لیے۔"

"تم خود بھی جاؤ گے۔"

"نہیں میں کاروبار کا خیال رکھوں گا۔"

"حالات واقعی دگرگوں ہو رہے ہیں۔"

"ہاں بہت سی جانیں ضائع ہو گئی ہیں لاکھوں ڈالروں کا نقصان ہو چکا ہے۔"

"اچھا ویزوں کا کل انتظام ہو جائے گا بے فکر رہو۔"

"شکریہ"

شام ۷ بجے

"ولیم۔ میرا خاندان امریکہ جا رہا ہے۔"

"کب جانا چاہتا ہے حسین۔"

"کل یا پرسوں۔"

"کتنی ٹکٹیں چاہئیں؟"

"تین - ایک بیوی کی ایک بیٹے اور ایک بیٹی کی"۔

"اور تمھاری"

"نہیں میں نہیں جا رہا"۔

"وہ صبح کی پرواز پر جانا چاہیں گے یا شام کی"۔

"ذرا رکو میں ان سے فون پر بات کر لوں"۔

"اچھا بتاؤ کیا پیو گے"۔

"ڈبل سکاچ"۔

"آن دی راکس"۔

"ہاں"

محمد حسین گھر فون کرتا ہے ـــــ گھنٹی بجتی ہے اور بجتی رہتی ہے۔

"حسین حسین"

"کیا بات ہے ولیم"۔

"غضب ہو گیا"۔

"کیا ہوا؟"

"ادھر آؤ ٹی وی پر دیکھو ـــــ کالوں نے تمھارے علاقے پر حملہ کر دیا ہے ـــــ گھر جل رہے ہیں - لوگ بھاگ رہے ہیں - ایمبولینس اور فائر ٹرک آ رہے ہیں"۔

حسین نے خوفزدہ ہو کر دیکھا - اس کا علاقہ واقعی جل رہا تھا۔

وہ بھاگا ـــــ اپنی مرسیڈیز لے کر ـــــ

وہ جتنی تیزی سے کار چلا رہا تھا اتنی ہی تیزی سے خیالات اس کے ذہن میں آ رہے تھے۔

میرے دادا نے ہندوستان چھوڑا۔

بہتر مستقبل کے لیے جنوبی افریقہ چلے آئے۔

عام سا کاروبار شروع کیا۔

میرے باپ نے بہت محنت کی ـــــ جان کی بازی لگا دی ـــــ کپڑوں کا کاروبار کیا ـــــ لکھ پتی بن گئے ـــــ انگریز حکومت کی نگاہوں میں معتبر تھے ـــــ سارے علاقے کی رپورٹ پہنچاتے تھے وہ چاہتے تھے ان کے بچے ان کے کندھوں سے زندگی کا آغاز کریں میرے بھائی کو امریکہ بھیج دیا - میں لکھ پتی بن گیا۔

میں چاہتا ہوں کہ میرے بچے میرے کندھوں سے زندگی کا آغاز کریں۔

کیا وہ بلندی پر پہنچنے سے پہلے گر تو نہیں گئے۔
محمد حسین گھر پہنچا لیکن وہاں دھوئیں کے بادلوں کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔
اس کا گھر ہی نہیں انڈینز کی ساری بستی ہی جل چکی تھی —— ملبے کا ڈھیر تھا۔ گوری پولیس نے بچاؤ کی کوشش کی لیکن ان کے بھی بہت سے سپاہی مارے گئے اور جل گئے۔
محمد حسین ایک طرف کھڑا آنسو بہا رہا تھا۔
بہت سے انڈین اور گورے خاندان جمع ہو چکے تھے۔
مرد رو رہے تھے عورتیں بین کر رہی تھیں۔
سامنے جلی ہوئی لاشوں کا انبار لگا ہوا تھا۔
رونے والوں کا رنگ گورا اور بھورا تھا لیکن لاشوں نے جل کر کالوں کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔

رات

محمد حسین ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔
ڈراونے خواب دیکھتا رہا۔

ستمبر ۱۹۸۵ء

ریت کے محل

اس کی عمر بمشکل پانچ سال تھی۔

وہ اپنے خاندان کے ساتھ بحرِ ہند کے ساحل پر سیر کرنے آیا تھا۔ تازہ ہوا، سورج کی روشنی اور پانی کی لہروں کے منظر نے اسے مسحور کر دیا تھا۔ "ممی میں نہانا چاہتا ہوں" اس نے معصوم سی خواہش کا اظہار کیا۔ ممی نے اس کے کپڑے بدل کر اسے سومنگ سوٹ پہنا دیا۔ "شون بیٹا! دور نہیں جانا" شون تیزی سے پانی کی طرف بڑھنے لگا۔ پانی نے اس کے پاؤں چھوئے تو وہ خوشی سے اچھل پڑا "ممی پانی بہت ٹھنڈا ہے" وہ زور سے بولا "دھیان سے" ماں نے پھر تلقین کی۔

شون کافی دیر تک پانی سے اٹھکیلیاں کرتا رہا۔ کبھی وہ ساحل سے سیپیاں چنتا اور کبھی گیلی ریت پر اپنے نقشِ قدم دیکھ کر خوش ہوتا۔ اس کے ساتھ کھیلنے والا کوئی نہیں تھا۔ جب وہ چلتے چلتے تھک گیا تو ریت سے محل بنانے لگا۔

وہ گیلی ریت سے گولے بناتا ــــ پھر دیواریں بناتا، پھر ان کی چھت بنانے کی کوشش کرتا ــــ جب چھت گرنے لگتی تو خود ہی کھلکھلا کر ہنس دیتا ــــ اتنے میں اسے دور ایک کالا بچہ کھڑا نظر آیا جو اس کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ شون نے بھی اس کی طرف دیکھا اور ہاتھ ہلایا۔ وہ کالا بچہ آنکھوں میں خلوص پا کر قریب آگیا۔

دونوں تعارف کروائے بغیر اکٹھے کھیلنے لگے جیسے پرانے دوست ہوں دونوں نے ریت کے محل بنانے شروع کیے اب اگر چھت گرتی تو دونوں اکٹھے ہنس دیتے۔

اتنے میں پولیس کا ایک سپاہی ان کی طرف آیا اور کالے بچّے کو بازو سے پکڑ کر لے جانے لگا۔

"اسے کیوں لے جا رہے ہو؟" شون نے پوچھا۔

"یہ کالا ہے اسے یہاں کھیلنے کی اجازت نہیں یہ BEACH صرف گوروں کیلیے ہے۔"

”لیکن یہ میرا دوست ہے“، شون چیخا۔

پولیس آفیسر شون کی بات کو نظر انداز کر کے کالے بچّے کو لے گیا۔ دونوں بچّے سہم گئے۔ کالے بچے کی آنکھوں میں خوف کے سائے اور شون کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

شون بھاگا بھاگا اپنے دادا کے پاس آیا۔

”گرینڈ پا! وہ میرے دوست کو لے گیا۔“

”کون بیٹا؟“

”وہ گندا آدمی“

”کون سا؟“

”پولیس آفیسر کہتا ہے میرا دوست کالا ہے۔“

”ہاں بیٹا۔ شاہین کے بچے کووں کے ساتھ نہیں کھیلا کرتے۔“

شون کچھ نہ سمجھتے ہوئے اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔

کچھ عرصے کے بعد شون پھر اپنے خاندان کے ساتھ ساحلِ سمندر پر گیا وہ نیکر پہن کر دھوپ میں اچھل کود رہا تھا اور بیسیوں مردوں، عورتوں کو دھوپ میں لیٹے دیکھ رہا تھا۔

”ممی یہ سب لوگ دھوپ میں کیوں لیٹے ہیں کیا یہ بیمار ہیں؟“

”نہیں بیٹا“ ماں مسکرائی ”یہ سن بیدنگ کر رہے ہیں۔“

”وہ کیوں؟“ شون کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔“

”تاکہ ان کی جلد ٹین ہو جائے۔“

”تو کیا وہ کلرڈ یا انڈین بننا چاہتے ہیں؟“ شون نے معصوم سا سوال کیا۔

”نہیں بیٹا وہ تفریح کر رہے ہیں“ ماں بات ٹال گئی اور شون اکیلے میں کھیلنے لگا۔

اسے اس دفعہ بھی دوستوں کی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد کچھ اور گورے بچّے آ گئے اور وہ سب کھیلنے لگے شون نے ایک دفعہ پھر ریت کے محل بنانے شروع کیے۔ وہ ریت سے محل بناتا لیکن جب وہ سمندر کی لہروں کے ساتھ بہہ جاتے تو ہنسنے لگتا۔

اسے ابھی محل بنانے میں مہارت حاصل نہیں ہوئی تھی۔

اس کے قریب ہی چند نوجوان لڑکے اور لڑکیاں FRIZBY کھیل رہے تھے شون نے کبھی یہ کھیل نہ کھیلا تھا وہ انھیں غور سے دیکھنے لگا۔ ا[illegible] انڈین لڑکا ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا

اس نے سومنگ سوٹ پہن رکھا تھا وہ بھی FRIZBY کا کھیل دیکھ رہا تھا۔ گورے لڑکے اور لڑکیوں کو اس کا کھڑا ہونا ناگوار گزرا اور وہ اس کا مذاق اڑانے لگے۔ شون کو سمجھ نہ آسکا کہ وہ اس کا کیوں مذاق اڑا رہے ہیں۔

پھر وہ انڈین لڑکا پانی کی طرف بڑھنے لگا۔

"او انڈین" ایک لڑکی چیخی۔

"تم اس میں نہیں نہا سکتے" دوسرا لڑکا بولا۔

"وہ کیوں؟" اس نے پوچھا۔

"تم انڈین ہو"

"اور یہ بھی تو انڈین اوشن ہے" وہ لڑکا چیخا۔

کھیل بند ہو گیا۔ سب لڑکے لڑکیاں احتجاج کرنے لگے اور شون وہاں سراپا حیرت بنا دیکھتا رہ گیا۔

اس نے پہلے کبھی لڑائی ہوتے نہیں دیکھی تھی اس لیے وہ گھبرا سا گیا اور بھاگ کر ماں کی گود میں چھپ گیا۔

اتنے میں پولیس آفیسر آیا اور انڈین کو لے گیا۔

شون ابھی تک ماں کی گود میں دبکا بیٹھا تھا۔

ایک کالا لڑکا اس کے لیے اورنج جوس لے کر آیا۔

"شون بیٹا! جوس پیو گے؟"

"ہاں ممی"

"ایک جوس اور لے کر آؤ" ممی نے کالے لڑکے کو آرڈر دیا۔

"ممی یہ کالا لڑکا یہاں کیا کرتا ہے؟"

"نوکری کرتا ہے"

"اسے پولیس آفیسر پکڑ کر نہیں لے جاتا"

"نہیں بیٹا اسے صرف کھیلنے اور تیرنے کی اجازت نہیں ہوتی"

شون کو یہ بات کچھ اچھی نہ لگی۔

شون نے اورنج جوس کا صرف ایک ہی گھونٹ پیا۔

اس سے باقی جوس نہ پیا گیا ——— نجانے کیوں۔

شون کے والدین کی، جن کی رہائش BEACH سے چند میل دور ڈربن میں تھی، جوہنز برگ تبدیلی ہوگئی۔ پھر کیپ ٹاؤن شون کو ڈربن اور ساحلِ سمندر یاد آتا لیکن وہ اور بھی بہت سی یادوں کی طرح اسے ذہن کے کسی طاقچے پر رکھ کر بھول جاتا۔

کئی سالوں کے بعد شون کا ڈربن آنا ہوا۔
اب وہ جوان ہو چکا تھا۔
زندگی بہت سے رنگ بدل چکی تھی۔
شون سیر کرتے ہوئے پھر اسی BEACH پر آگیا جہاں وہ بچپن میں آیا کرتا تھا۔
اسے بہت سی خوشگوار تبدیلیوں کا احساس ہوا۔
وہاں نہ تو پولیس آفیسر تھے اور نہ ہی وہ بورڈ جن پر لکھا تھا کہ وہ BEACH صرف گوروں کے لیے ہے۔
ساحل پر ہر رنگ اور نسل کے مرد، عورتیں اور بچّے سیر کر رہے تھے اور نہا رہے تھے۔
اس نے اپنی کار پارک کی اور سومنگ سوٹ پہن کر ساحل کی طرف چل دیا۔
وہی دھوپ، وہی تازہ ہوا اور وہی پانی کی لہریں تھیں لیکن ان میں زیادہ سرور تھا۔
بہت سی بھولی ہوئی یادیں اس کا خیر مقدم کرنے آگئیں۔
وہ کافی دیر تک چہل قدمی کرتا رہا اور پھر نہانے لگا۔
نہانے کے بعد وہ دھوپ سینکنے ریت پر لیٹ گیا۔
اس کے ہاتھ غیر شعوری طور پر ریت سے کھیلنے لگے۔
وہ ریت کے محل بنانے لگا لیکن وہ گر گر جاتے۔
اتنے میں اس کے قریب ایک انڈین بچّہ آگیا وہ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ پھر مسکرا دیا۔
"کیا حال ہے؟" شون نے پوچھا۔
"ٹھیک ہوں۔ آپ کیا بنا رہے ہیں" بچے نے معصومیت سے پوچھا۔
"ریت کے محل"
"آئیں میرے ساتھ چلیں۔"
"کہاں؟" شون نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔
"ساحل سے ذرا دور۔"
"وہاں کیا ہے" شون اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"کچھ مٹی ہے۔"

"اس سے کیا کریں گے؟"

"ہم دونوں مل کر مٹی کے مکان بنائیں گے۔"

"مٹی سے کیوں؟" شون حیرت سے پوچھنے لگا۔

وہ انڈین بچہ رک گیا۔ شون کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر خاموش رہا پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"مجھے مٹی زیادہ اچھی لگتی ہے۔"

اور شون پھر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

جنوری ۱۹۸۶ء

آواز کی موت

سارے گاؤں میں ایک موت کا سا سکوت ہے۔
پریٹوریا سے یہ پیغام آیا ہے کہ وہ علاقہ گوروں کے لیے وقف کر دیا گیا ہے۔
ایک مہینے کے اندر سب لوگوں کو چلے جانا ہے۔
اس کے بعد سب گھر گرا دیے جائیں گے۔
چاروں طرف بلڈوزر عمارتوں کو مسمار کر دیں گے۔
نئے گھر نئی عمارات۔
نئے اسکول نئے سومنگ پول۔
نئے کلب نئے کھیل کے میدان تعمیر ہوں گے لیکن۔
وہ صرف گوروں کے لیے ہوں گے۔
کون بے گھر ہونا چاہتا ہے؟
لیکن؟
"نہ" کہنے کی کس میں ہمت ہے۔
سب لوگ بادلِ ناخواستہ تیاری شروع کر دیتے ہیں۔
ان کے دل مغموم اور آنکھیں نم ہیں۔
پورے گاؤں پر سکوت طاری ہے۔
وہ ان لوگوں اور دیہاتوں کا حال دیکھ چکے ہیں۔
جنھوں نے انکار کیا تھا۔
بیسیوں خاندان ہجرت کر رہے ہیں۔
خدا جانے کہاں جا رہے ہیں۔

دو ہفتے گزر گئے۔
آدھا گاؤں جا چکا ہے۔
چار ہفتے گزرنے کو ہیں۔
سارا گاؤں خالی ہو گیا ہے۔
صرف ایک شخص حسین باقی بچ گیا ہے۔
وہ گاؤں کی مسجد میں آبسا ہے۔
وہ سب سے کہتا ہے "یہ ناانصافی ہے"
"ہم بھی انسان ہیں"
"ہمیں بھی زندہ رہنے کا حق ہے"
اکثر لوگ خاموش رہتے ہیں۔
بعض کھسیانی ہنسی ہنس دیتے ہیں اور رخصت ہو جاتے ہیں۔
وہ اکیلا مسجد میں رہ گیا ہے۔
ہر صبح اٹھ کر اذان دیتا ہے۔
گاؤں مسمار ہو گیا —— گورے آبسے
مسجد ابھی بھی قائم ہے۔
اذان کی آواز ہر صبح آتی ہے۔
گوروں کو بے وقت جگا دیتی ہے۔
وہ حسین کو اذان نہ دینے کی تنبیہ کرتے ہیں۔
وہ نہیں مانتا۔
وہ حسین کو عدالت میں لے جانے کی دھمکی دیتے ہیں۔
وہ نہیں مانتا۔
وہ حسین کو اغوا کرنے کی افواہ پھیلاتے ہیں۔
وہ نہیں مانتا۔
ایک صبح اذان کی آواز نہیں آتی۔
صبح کی ہوائیں حسین کی آواز سے محروم ہو جاتی ہیں۔
پولیس مسجد میں جاتی ہے۔
حسین چھت سے لٹکا ہوا ہے اس کا گلا کٹ چکا ہے۔

وہ اسے مسجد کے صحن میں دفن کر دیتے ہیں۔
اگلے دن اخبار میں خبر چھپتی ہے۔
"حسین ایک حادثے کا شکار ہو کر مر گیا۔"

جنوری ۱۹۸۶ء

سفید کانٹوں کی دیوار

یہ جنوبی افریقہ کی سرزمین ہے۔
آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں۔
زمین پر سفید کانٹوں کی دیوار پھیلی ہوئی ہے۔
یہ دیوار نہ صرف بہت لمبی ہے بلکہ نوکیلے اور خطرناک کانٹوں سے بھری پڑی ہے۔
دیوار کے ایک طرف بیسیوں کلرڈ اور انڈین اساتذہ کھڑے ہیں۔
دیوار کے دوسرے طرف ہزاروں سیاہ بچے منتظر ہیں۔
اساتذہ پکارتے ہیں "ہم پڑھانے کے لیے بے تاب ہیں"
طلباء پکارتے ہیں "ہم پڑھنے کے لیے بے چین ہیں"
ہر کانٹا پکارتا ہے "ایسا ہونا ناممکن ہے"
اساتذہ اور طلباء ان کانٹوں سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔
وہ ہر صبح اس امید پر آتے ہیں کہ وہ اس دیوار کو گرا کر ایک دوسرے سے مل جائیں گے۔
اساتذہ ایک طرف سے اور بچے دوسری طرف سے ان کانٹوں کو توڑنا شروع کرتے ہیں۔
ان کے ہاتھ اوزاروں سے محروم ہیں۔
ان کی انگلیاں لہولہان۔
کلرڈ اور انڈین اساتذہ بے روزگار ہیں۔ وہ ملازمت چاہتے پڑھانا چاہتے ہیں۔
کالے بچے کمرۂ جماعت میں بیٹھے ہیں کمرۂ جماعت اساتذہ سے خالی ہے کوئی پڑھانے والا نہیں۔
کلرڈ اور انڈین اساتذہ کالے مدرسوں میں نہیں پڑھا سکتے۔
کالے بچے کلرڈ اور انڈین مدرسوں میں نہیں پڑھ سکتے۔
اساتذہ اور بچے سارا دن کانٹے توڑتے رہتے ہیں۔
ان کی آنکھیں غمگین ہیں، دل افسردہ، انگلیاں لہولہان۔

شام تک دیوار کے کچھ کانٹے کم ہوتے ہیں۔
وہ گھر چلے جاتے ہیں۔
صبح کو دیوار پھر کانٹوں سے بھری ہوئی ہے۔
شائد رات کو کچھ لوگ پھر سفید کانٹے پھیلا گئے۔
صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے — کانٹے کم ہوتے ہیں۔
رات ہوتی ہے — کانٹے بڑھ جاتے ہیں۔
کانٹوں پر خون کی ایک تہہ جمتی جارہی ہے۔
دیوار پر خون کی لکیر بنتی جارہی ہے۔

حالات بدل رہے ہیں۔
آسمان کے سیاہ بادل چھٹتے جارہے ہیں۔
اساتذہ اور بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔
ان کی انگلیوں میں مہارت پیدا ہوتی جارہی ہے۔
ان کے جذبوں میں تقویت پیدا ہوتی جارہی ہے۔
رات کو کانٹے پھیلانے والے تھکتے جارہے ہیں۔
سفید کانٹوں کی دیوار کم ہوتی جارہی ہے۔
حوصلے بڑھتے جارہے ہیں۔

جنوری ۱۹۸۶ء